www.urducouncil.nic.in

قیمت : -/15 ₹

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ

خواتین دنیا

نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly , New Delhi

فروری 2026

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں

دلچسپ کہانیاں

سائنس وٹیکنالوجی

معلوماتی مضامین

صحتِ اطفال

بچّوں کا کتب خانہ

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ زبان شناسی

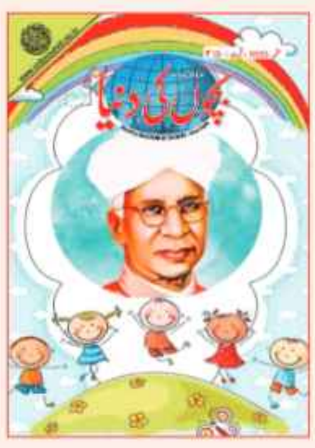

میرا بچپن ◆ بچوں کے بڑے ادیب

بچوں کی پینٹنگ ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچّوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ:15 روپے سالانہ:145 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرِتعاون سالانہ 145 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 ،A/C: IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون:011-26109746، فیکس:011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ : 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 1-5، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون:040 - 24415194

اس شمارے میں

ادار یہ

مشعل — مدیر — 4

شخصیات

مولانا آزاد: پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی — مہتاب جہاں — 5

نازک الملائکہ: عورت، شاعری اور آزادی کا فکری امتزاج — وسیم حسن راجا — 10

دیارِ مغرب کا ایک اہم شاعر: عدیل زیدی — شاذیہ عمیر — 15

جہان نسواں

ڈاکٹر مہر افروز کی نگارشات — غضنفر اقبال — 19

اکیسویں صدی کے اردو افسانوں میں نسوانی حسیت — عرشیہ جبین — 23

انڈین نالج سسٹم: اردو تراجم کے آئینے میں — شہلا کلیم — 28

مشتاق احمد نوری کا افسانوی سفر — عنبر فشاں — 32

تقسیم ہند کا المیہ اور ناول 'پنجر' — عبدالوارث — 36

فراموش کردہ ابتدائی خواتین افسانہ نگار — گلشن عبداللہ — 41

دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ: ایک جائزہ — صاعقہ غیاث — 47

خواتین اور ماحولیات

ماحولیات کے تحفظ میں خواتین کا کردار — جمیلہ خاتون — 51

حسن سخن

نظم (وہ بال برابر کا فرق) — نورینہ پروین — 54

نظم (اللہ حافظ امی جان!) — سیدہ ایمن عبدالستار — 54

افسانے

گردش ایام — رینو بہل — 55

پچھتاوا — حکیم رئیس فاطمہ — 59

آدھی آبادی کے جذبات و احساسات کا ترجمان

ماہنامہ خواتین دنیا نئی دہلی

Mahnama Khawateen Duniya Monthly, New Delhi

جلد: 10 شمارہ: 2 فروری 2026

مدیر اعلیٰ : ڈاکٹر شمس اقبال

مدیر منتظم : ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی

معاون مدیر : ڈاکٹر مسرت

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع: میکاف پرنٹرس، B-127، سیکٹر 65

نوئیڈا۔ 201301 (یوپی)

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/15 روپے، سالانہ -/145 روپے

صفحات: Total Pages 64

■ قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل (NCPUL)

اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں

● ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا

جسولہ، نئی دہلی-110025، فون: 011-49539000

شعبۂ ادارت: 011-49539009

نگارشات ارسال کرنے کے لیے

ای میل: kduniya@ncpul.in

editor@ncpul.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002

فون: 24415194 - 040

مشعل

ماحولیات سے خواتین کا تعلق بہت گہرا ہے۔ خواتین قدرتی وسائل کے تحفظ و استعمال میں کلیدی کردار ادا کرتی ہیں بلکہ معاشی نظام میں ان کی مثبت شمولیت ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔ ماحول اور خواتین میں جب تال میل بنا رہتا ہے تو ایک خوش کن ماحول بنتا ہے۔ ماحولیات کے متعلق بہت سے مسائل سے آج ہماری خواتین دو چار ہیں۔ پے در پے انھیں بہت سے مسائل کا سامنا ہے۔

ماحولیات کا تعلق زندگی کے تمام شعبوں سے ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے، اگر اس سیاق میں دیکھا جائے تو ایک گھر کو جنت بنانے میں عورتوں کا اہم کردار ہوتا ہے۔ گھر کے ماحول سے لے کر دفتر، کارخانوں، دانشگاہوں میں ایک عورت کا کردار ہی اسے خوشنما و دل پسند بناتا ہے۔ ماحولیات کا لفظ نہایت وسیع معنی کا حامل ہے۔ آبادی سے لے کر صحرا و جنگل تک اس کی وسعت انسان، حیوان، پیڑ پودوں کو محیط ہے۔ معاشرے میں پائی جانے والی آلودگی جہاں سانس لینے میں مضر ہوتی ہے وہیں دوسری اقسام کی آلودگی سماج میں انسانی زندگی کو متاثر کرتی ہے۔ گھر کا ماحول اگر اچھا نہیں ہے، محلے پڑوس کا ماحول اگر من پسند نہیں ہے جہاں شور و ہنگامہ سے روزمرہ کی زندگی متاثر ہوتی ہے وہاں اچھی اور کارآمد نسل پیدا نہیں ہوسکتی۔ اس وقت آبی آلودگی کا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ خواتین کی حصے داری مثبت نتائج لا رہی ہے۔

خواتین کاروباری اور تجارت کے میدان میں مردوں کے شانہ بہ شانہ چلتے ہوئے اپنی صلاحیت سے نئے نئے طریقے و اصول متعارف کرا رہی ہیں، صنعتوں کو تبدیل کر رہی ہیں اور اپنی بصیرت کی قیادت سے رکاوٹوں کو دور کر رہی ہیں۔ خواتین جب کسی تحریک کا حصہ بنتی ہیں تو بے شمار لوگوں کو بڑے خواب دیکھنے کی ترغیب دیتی ہیں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ خواتین کا فطرت سے ایک قدیم رشتہ ہے۔ دنیا بھر کے ملکوں میں پانی، جنگلات اور زمین بچانے کی لڑائی جاری ہے۔ ہندوستان میں ماحولیات بچاؤ مہم کی طویل تاریخ ہے۔ اس تحریک میں چپکو آندولن 1970 کو سب سے زیادہ طاقتور تحریکوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ دراصل، اس تحریک کا مقصد درختوں کی کٹائی کو روکنا تھا۔

'نرمدا بچاؤ آندولن' کی قیادت معروف ماہر ماحولیات میدھا پاٹکر نے کی تھی۔ وہ سردار سروور پروجیکٹ کے سبب وردھا کے مقامی ماحولیاتی تحفظ نیز، قبائلیوں کے حقوق کے لیے ہمیشہ آواز بلند کرتی رہیں۔ 'نودھانیا آندولن' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے جس کے تحت آرگینک فارمنگ کے لیے لوگوں کو ٹریننگ دی جاتی ہے۔

پوری دنیا میں خواتین موسمیاتی مسائل کے حل تلاش کرنے کے لیے سائنس، ٹیکنالوجی، انجینئرنگ اور ریاضی (ایس ٹی ای ایم یا سٹیم) کی مہارتوں کو استعمال میں لا رہی ہیں۔ ہندوستانی خواتین نے ثابت کیا ہے کہ ماحولیات کا تحفظ ایک اخلاقی اور ثقافتی ذمے داری بھی ہے۔ ہندوستانی خواتین جنگلات، پانی، زمین، فضا اور حیاتیاتی تنوع میں ایک قائدانہ رول ادا کر رہی ہیں۔

آپ کا

شمس اقبال

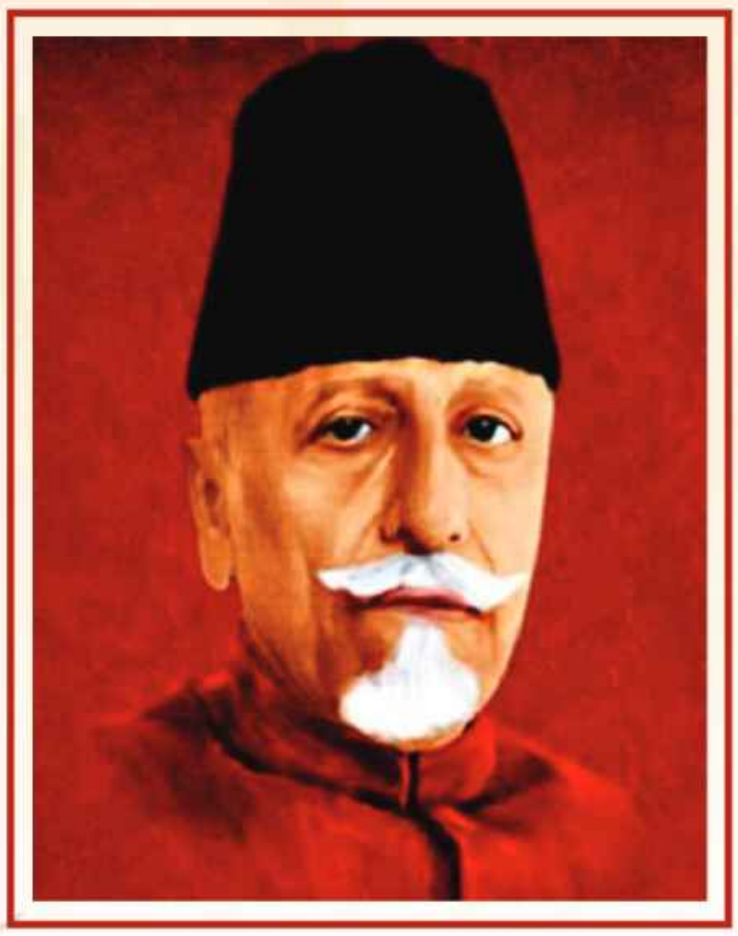

مہتاب جہاں

مولانا آزاد

'پوچھی زمین کی تو کہی آسمان کی'

ہندوستان کے اولین وزیر تعلیم ، روشن دماغ صحافی ، کامیاب سیاست داں قومی اور مذہبی رہنما کی شخصیت کے مختلف پہلو ہیں ۔ مولانا کی شخصیت برصغیر کی وسیع سرزمین کے آسمان پر آفتاب جہاں تاب کی طرح تابندہ اور درخشندہ ہے ۔ یہ گمان گزرتا ہے کہ مولانا کی ذات کو معبود نے عالم انسانیت کے لیے خاص طور پر کُرۂ ارض پر بھیجا تھا۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتیں حیرت انگیز ہیں جن میں تحریر اور تقریر دونوں شامل ہیں۔ ان کی تحریریں عزیمت استقامت آئینہ طبع کے درخشاں تریں جوہر ہیں۔

مولانا محی الدین ابوالکلام آزاد بذات خود ایک انجمن تھے ۔ جہاں ان کے قلم سے موتی بکھرتے تھے، منہ سے پھول برستے تھے تو وہیں کبھی کبھی چنگاریاں بھی نکلتی تھیں۔ ان کی شخصیت کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ سچ کو روشن کرنے اور باطن کو دبانے کی صلاحیت رکھتے تھے ۔ مولانا کی شخصیت کا احاطہ کرنے کے بعد یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی شخصیت تدبیر سیاست میں زیادہ ممتاز تھی یا علم وادب میں، دنیا نے دیکھا کہ انھوں نے علم کو وسیلہ معاش بنایا اور سیاست کو خدمت خلق ۔ انھوں نے کبھی اپنی ذات پر رائے یا مسلک کے تضادات کو اثر انداز نہیں ہونے دیا۔

مولانا نے مقام صبر کے واجبات جس شان سے ادا کیے ان کی مثالیں تاریخ میں کم ملتیں ہیں ۔ وہ علوم قدیمہ، عہد وسطیٰ اور علوم جدید کے عالم، سحر طراز ، انشاء پرداز اور بلند پایہ ادیب تھے ۔ جلوہ فشاں خطیب ،فہم وتدبر کے مرقع ، ذہانت وخطابت اوصاف وکمالات مرجع ان کی شخصیت بذات خود ایک تاریخ اور تاریخ ساز ، ایک عہد اور ایک عہد آفرین۔ مولانا کی شخصیت نے علم وحکمت ، شعروادب ،فکر ونظر اور احساس وشعور کی دنیا میں طوفان برپا کر گیا۔ ہر جگہ صدر انجمن اور سرمحل آپ کی شخصیت رہی ۔ ان کے قد وقامت کا کوئی سہیم وشریک نہ تھا۔

مولانا کی ذات ایک انجمن تھی ۔ ان کی تقریر فکر ونظر کی نئی دنیا سامنے لاتی ہے ۔ ہر مسئلے پر ، اس کے تمام تر پہلوؤں پر غور وفکر کرنے کے بعد کچھ فرماتے تھے ان کی رائے کی قدر گاندھی جی اور نہرو جی کرتے تھے ۔ ان کی زندگی کے دینی ، سیاسی ، ادبی علمی اور صحافتی جیسے پڑاؤ ہیں۔ مگر ان سب کے باوجود ان کی شخصیت ایک مولوی کی نہ ہوکر اشرافی کی تھی۔

مولانا کی نسل، شجرۂ نسب اور خاندان کا مختصر تعارف:۔

مولانا کے بزرگ اکبر کے زمانے کے مشہور علماء گزرے ہیں۔ آپ کے بزرگوار شیخ جمال الدین جنھوں نے اکبر کے دین الٰہی کے خلاف فتویٰ دیا تھا۔ مولانا کے والد خیر الدین مرحوم دہلی کے رہنے والے تھے ۔ جو مکہ معظّمہ میں جا بسے اور ایک عرب خاتون سے شادی کر لی تھی یعنی مولانا کی والدہ مدینہ منورہ کے مفتی شیخ عبداللہ شیرازی کی بھانجی تھیں ۔ پانچ بچوں میں مولانا سب سے چھوٹے تھے ۔ مکہ معظّمہ میں مولانا 1888 میں پیدا ہوئے ۔ ان کے

والد علاج کے واسطے ممبئی آئے اور ان کے مریدوں نے انھیں ہندوستان سے جانے نہیں دیا اور سب لوگ کلکتہ میں رہنے لگے۔ جہاں 1908 میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ ان کا خاندان بعد میں کلکتہ (موجودہ کولکاتا) واپس آ گیا، جہاں ان کی تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔

مولانا آزاد نے بہت کم عمری میں ہی غیر معمولی ذہانت اور علمی استعداد کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے ابتدائی تعلیم اپنے والد اور دیگر اساتذہ سے حاصل کی۔ قرآن، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی علوم میں مہارت حاصل کرنے کے بعد انھوں نے دیگر زبانوں اور علوم کا بھی مطالعہ کیا۔ فارسی اور عربی میں ان کی مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کم عمری میں ہی عربی اور فارسی زبان میں مختلف کتابیں پڑھنے اور ان پر تبصرہ کرنے کے قابل تھے۔ انھوں نے فارسی، اردو، عربی، اور انگریزی زبانوں میں مہارت حاصل کی اور فرانسیسی زبان کا بھی مطالعہ کیا۔

مولانا آزاد کی ابتدائی زندگی میں علمی ماحول کا بہت بڑا اثر تھا۔ ان کے والد ایک سخت گیر مگر محبت کرنے والے استاد تھے جو اپنے بیٹے کی علمی ترقی کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ مولانا آزاد نے بچپن ہی سے علم کی اہمیت کو سمجھا اور اپنی زندگی کو علمی سفر کے لیے وقف کر دیا۔ ان کی والدہ بھی تعلیم یافتہ تھیں اور انھوں نے بھی مولانا آزاد کی تعلیم و تربیت میں اہم کردار ادا کیا۔

مولانا آزاد کی تعلیم صرف مدرسے تک محدود نہیں تھی۔ انھوں نے غیر روایتی تعلیم کا بھی اہتمام کیا اور جدید علوم و فنون میں بھی دلچسپی لی۔ انھوں نے انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی اور مغربی علوم و فنون کا بھی مطالعہ کیا۔ ان کی ذہانت اور علمی استعداد کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے بہت کم عمری میں ہی مختلف زبانوں میں مہارت حاصل کر لی تھی اور مختلف موضوعات پر لکھنے اور بولنے کے قابل تھے۔

(ماخوذ از۔ مولانا ابوالکلام آزاد از عابد رضا بیدار۔ 1968 ص۔ 65۔39)

مولانا آزاد کی جوانی کی زندگی میں بھی ان کی علمی اور سیاسی سرگرمیاں نمایاں تھیں۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم مکمل کرنے کے بعد علمی اور فکری میدان میں قدم رکھا۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین لکھے اور علمی مباحثوں میں حصہ لیا۔ ان کی تحریریں اور تقاریر نے ان کی علمی استعداد کا لوہا منوایا۔ انشاء پردازی کے آبدار موتی اپنی نگارشات میں جا بجا بکھیرے۔ نمونے کے طور پر اس اقتباس کو دیکھا جا سکتا ہے۔

”جنگل کے مور کو کبھی باغ و چمن کی جستجو نہیں ہوتی۔ اس کا چمن خود اس کی بغل میں موجود ہوتا ہے جہاں کہیں اپنا پر کھول دے گا، ایک چمنستان بوقلمون کھل جائے گا۔“

(غبار خاطر، مرتبہ مالک رام۔ 1982۔ ص 68)

مولانا آزاد کی شخصیت میں علم اور سیاست کا حسین امتزاج تھا۔ انھوں نے علمی اور فکری میدان میں بھی نمایاں خدمات انجام دیں اور سیاسی میدان میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو ایک مثال ہے اور ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

مولانا کی ادبی زندگی کا آغاز بارہ سال کی عمر سے ہوا۔ پہلے تو شاعری اور بعد ازاں نثر کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان کے دادا مولانا محمد ہادی اپنے وقت کے جید اور مشہور عالم تھے۔ ان کا تقرر 1834 میں بہ حیثیت آگرے کے قلعہ دار کے عہدے پر ہوا تھا۔ مولانا کے والد محترم مولانا خیر الدین جب تین سال کے تھے تب ان کے چچا مولانا منصور الدین 1855 میں انھیں اپنے ہمراہ لے کر حجاز چلے گئے تھے۔ مولانا کی کامیابی اور ان کی شہرت میں ان کی شریک حیات زلیخا بیگم کا اہم رول رہا۔ انھوں نے ہمیشہ اپنے شوہر کا حوصلہ بڑھایا۔ مولانا کی کامیابی میں بیگم صاحبہ کی قربانیاں ناقابل فراموش ہیں۔ مولانا کی قومی اور ملکی خدمات میں بھی ان کی بیگم ہمیشہ مولانا کے ساتھ تھیں۔

(ماخوذ از۔ مولانا ابوالکلام آزاد از عابد رضا بیدار۔ 1968 ص۔ 65۔39)

مولانا آزاد اپنی خاندانی روایات، عالم دین اور اسلامی تعلیمات کی رو سے متعارف ہوئے اور ایک مدت تک ان کی تحریریں اسی موضوع سے متعلق رہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں کے

ذریعے دینِ محمدی کی بہترین خدمات انجام دیں ہیں۔

مولانا آزاد کی صحافتی زندگی بھی بہت متاثر کن ہے۔انھوں نے 1912 میں 'الہلال' نامی اخبار کا اجراء کیا۔ یہ اخبار آزادی کی تحریک میں ایک اہم پلیٹ فارم ثابت ہوا۔'الہلال' کے ذریعے مولانا آزاد نے مسلمانوں کو بیدار کیا اور انھیں جدو جہد آزادی میں حصہ لینے کی ترغیب دی۔'الہلال' کے بند ہونے کے بعد مولانا آزاد نے 'البلاغ' نامی دوسرا اخبار جاری کیا۔ ان اخباروں نے نہ صرف آزادی کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا بلکہ صحافت میں نئے رجحانات بھی متعارف کرائے۔

الہلال کے پہلے شمارے میں مولانا آزاد لکھتے ہیں:

''1906 کی موسم سرما کی آخری راتیں تھیں جب امرتسر میں میری چشم بیدار نے ایک خواب دیکھا۔انسان کے ارادوں اور منصوبوں کو جب تک وہ ذہن وتخیل میں ہیں عالم بیدار کا ایک خواب ہی سمجھنا چاہیے۔کامل چھ برس اس کی تعمیر کی۔ عشق آمیز جستجو میں گزر گئے۔امیدوں کی خلش اور ولولوں کی سوزش نے ہمیشہ مضطرب رکھا اور یاس وقنوط کا ہجوم بارہا حوصلہ وعزم پر غالب آ گیا۔لیکن الحمدوللہ ارادہ کا استحکام اور توفیق الٰہی کا اعتماد ہر حال میں طمانیت بخش تھا یہاں تک کہ آج اس خواب عزیز کی تعبیر علم وجود میں پیش نظر ہے۔''

(الہلال کلکتہ، جلد۔ا' شمارہ۔1' 3 جولائی 1912)

دانشور مانتے ہیں کہ مولانا نے الہلال کے ذریعے جو بنیادیں تعمیر کیں تھیں اسی پر جماعت اسلامی اور تبلیغ جماعت نے اپنی اپنی عمارتیں تعمیر کیں ۔ یوں تو الہلال کی عمر تین سال کی مدت پر مبنی رہی۔جب اس کی 25-20 ہزار کاپیاں چھپی تھیں۔ مگر اس کے قارئین کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ تھی ۔ الہلال نے سیاسی ، سماجی اور مذہبی اثر ڈالا ۔مسلمانوں کا کھویا ہوا وقار اور غیرت کو زندہ کرنے میں اس کا اہم رول رہا۔مولانا کا یہ پرچہ قرآن اور حدیث کی روشنی میں سعید حلیم پاشا، مصطفیٰ کمال پاشا ، جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبیدہ سے متاثر رہا۔

مولانا آزاد نے قرآنی تفسیر وتشریحات میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ان کی کتاب 'ترجمان القرآن' ان کے علمی اور فکری کارناموں کی بہترین مثال ہے۔ اس کتاب میں مولانا آزاد نے قرآن کی آیات کی جدید تشریح کی اور مسلمانوں کو جدید دور کے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔مولانا آزاد کے علمی وفکری مضامین نے مسلمانوں کو جدید دور کے مسائل کا حل پیش کیا اور انھیں علمی وفکری میدان میں آگے بڑھنے کی ترغیب دی۔افسوس کہ یہ مکمل نہ ہوسکی۔ مولانا نے اسے دومرتبہ مکمل کرنے کی کوشش کی مگر پولیس کے ذریعہ گھر کی تلاشی کے ضمن میں نسخہ درہم برہم ہوگیا تھا۔ترجمان القرآن کی صرف دو جلدیں ہی شائع ہوسکیں۔ 1932 میں ترجمان القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی تھی۔

مولانا آزاد کی دیگر تصانیف میں 'غبار خاطر'، 'انڈیا ونز فریڈم'، اور 'تذکرہ' شامل ہیں۔ ان کتابوں نے علمی دنیا میں نئے رجحانات متعارف کرائے اور ان کے دور کے مسائل کا حل پیش کیا۔ مولانا آزاد کی تحریریں نہ صرف علمی اعتبار سے اہم ہیں بلکہ ان میں فکری اور فلسفیانہ گہرائی بھی موجود ہے۔

مولانا آزاد نے عربی اور فارسی ادب میں بھی مہارت حاصل کی۔انھوں نے عربی زبان میں کئی اہم کتابیں تصنیف کیں اور فارسی شاعری میں بھی کمال حاصل کیا۔ ان کی عربی اور فارسی زبان میں مہارت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ کم عمری میں ہی مختلف علماء سے علمی مباحثے کیا کرتے تھے۔

مولانا آزاد نے اردو ادب میں بھی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ان کی اردو نثر اور شاعری دونوں ہی بہت مقبول ہوئیں۔انھوں نے "ترجمان القرآن" اور "غبار خاطر" جیسی مشہور کتابیں تصنیف کیں جو اردو ادب کے اہم اثاثے ہیں۔غبار خاطر کے بے شمار تراجم مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں ایک ترجمہ فارسی زبان میں محمد افسر رہبین نے بھی چند سال قبل کیا تھا جو غبار خاطر۔ مولانا ابوالکلام آزاد، بنیاد ہندوافغانستان، کابل سے 1392 خورشیدی میں انتشارات سعید شائع ہوا۔مگر اس ترجمے میں مترجم کا اہل زبان نہ ہونے کی وجہ سے

جابجا ترجمے میں نقائص صاف نظر آتے ہیں۔

مولانا آزاد کا علمی وفکری ورثہ آج بھی زندہ ہے۔ ان کی تحریریں اور تصانیف آج بھی علمی دنیا میں اہم مقام رکھتی ہیں اور ان کے افکار وخیالات سے ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔

جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں غبار خاطر مولانا آزاد کے خطوط کا مجموعہ ہے جو 24 خطوں پر مبنی ہے۔ جو قلعہ احمد نگر کی اسیری کے زمانے میں مولانا نے (اگست 1942۔ستمبر 1945) قلمبند کیے تھے اور یہ سارے خطوط حبیب الرحمٰن شیروانی کے نام ہیں۔لیکن یہ بھیجے نہیں جا سکے تھے۔شیروانی صاحب کو یہ خطوط تب ملے جب یہ کتابی شکل میں شائع ہو چکے تھے۔مولانا آزاد نے ان خطوط کو تاریخ وار ترتیب دیا اور 1946 میں شائع کیا۔

مالک رام نے غبار خاطر کے بارے میں لکھا ہے کہ

''دراصل یہ چند متفرق مضامین ہیں جنھیں خطوط کی شکل دے دی گئی ہے یوں معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم کچھ ایسی باتیں لکھنا چاہتے تھے جن کا آپس میں کوئی تعلق یا مربوط سلسلہ نہیں ہے۔'' (غبار خاطر' مرتبہ مالک رام۔1982۔ص8)

مولانا نے تفسیر القرآن میں ابن تیمیہ اور ابن قیم سے متاثر ہوکر تفسیر لکھی ہے۔مولانا آزاد کی ادبی حیثیت اور انداز اسلوب جداگانہ ہے۔ان کی تحریر انھیں بہترین ادیبوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔مولانا آزاد اور ان کے ہمکاروں نے اردو ادب کو بہت کچھ دیا۔مولانا آزاد 1946 سے لے کر اپنی وفات یعنی 1958 تک مسلسل بارہ سال تک ہندوستان کے وزیر تعلیم رہے ساتھ ہی ساتھ مختلف کمیٹیوں کے ممبر بھی۔ بے شمار کانفرنسیں اور تقریریں کیں۔ ہندوستانی تعلیمی ڈھانچہ آج تک مولانا کا مرہون منت ہے اور ہندوستانی تعلیم اور تعلیمی ادارے مولانا کی فکر اور پالیسی کو آج بھی قبول کرتے ہیں۔مولانا کی تقاریر ہماری میراث ہے جو ماضی کی پرتیں کھولتی ہیں تو مستقبل سے بھی روشناس کراتی ہیں۔

تاریخ ایک الگ موضوع ہے جس کے اصول وضوابط ہیں۔ تاریخ دانی اور تاریخ کی سمجھ مولانا کی خداداد صلاحیت تھی۔ان کی تصنیف کا ہر صفحہ تاریخ وادب کا ایک شاہکار ہے۔مولانا نے وقت کی قدر کی،اس لیے وقت نے بھی انھیں شہرت، عزت اور رتبہ عطا کیا۔مولانا آزاد انسانی حد بندیوں کے قائل نہیں تھے۔وہ بنی انسان کی جہد وسعی اور عروج وزوال کی داستان کو جغرافیائی اور لسانی قانون میں بٹا ہوا دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔مولانا مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کے حق میں تھے۔وہ ہندوستانی مسلمانوں کی اصلاح وتنظیم اور اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا پیغام لے کر اٹھے اس کے بعد انھیں تحریک آزادی میں شرکت کرتے ہی قومیت کے اس سوال کا سامنا کرنا پڑا جو آہستہ آہستہ بکھر کر پورے ملک کی فضا میں ایک انتشار پیدا کرنے لگا تھا۔تاریخ، عالم کا ایک ایسا تسلسل جس میں نہ نسلی امتیازات حائل ہوں نہ جغرافیائی حدود کو دخل ہو جو مولانا کے تاریخی شعور کا بنیادی پہلو تھا۔مولانا کے اس نظریہ کا عکس ترجمان القرآن میں دیکھا جا سکتا ہے۔اس کے اثرات ان کی ثقافتی اور ادبی زندگی کی تقریروں اور تحریروں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

(ماخوذ از ترجمان القرآن۔جلد چہارم۔ص406۔420)

مولانا آزاد کے تاریخی شعور نے خود ان کی زندگی کو بے حد متاثر کیا تھا۔وہ اپنے آپ کو ایک تاریخ ساز دور کے تاریخی عمل میں شریک ہوا محسوس کرتے تھے۔مولانا کی تقریروں اور بیان چاہے وہ جج کے سامنے دیے گئے یا پھر جلسوں اور کانفرنسوں میں، ہر جگہ تاریخی شواہد اور تاریخی واقعات ملتے ہیں۔جج کے سامنے مولانا جنگ کے بعد سب سے خوفناک جگہ عدالت کو بتاتے ہیں جس کے ضمن میں حضرت عیسیٰ اور سقراط کا واقعہ بیان کرتے ہیں۔اپنے خطبات میں حضرت سید بن المسیبؒ، حضرت مالک بن انسؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کی مشکلوں اور قربانیوں کا احاطہ کرتے نظر آتے ہیں تو ابو حنیفہؒ، امام شافعی، امام ابن تیمیہؒ اور مجدد الف ثانیؒ کا حوالہ بھی پیش کرنا نہیں بھولتے۔مولانا کے احساس کی اجنبیت کی جڑیں ان کے تاریخی شعور میں دور دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔مولانا خود اپنے متعلق کہتے تھے کہ وہ اس محل کے آدمی نہیں تھے، لیکن اس عہد اور اس دور کے سپرد کر دیے گئے۔(ماخوذ از خطبات آزاد۔ص121۔122)

مولانا جب کسی تصور یا اعتقاد کا تجزیہ کرتے ہیں تو ان کی تاریخی فکر ان کے ساتھ ہوتی ہے۔ان کے دماغ میں پوری دنیا گھومتی رہتی ہے۔مولانا کی ہر تحریر میں تاریخی شعور نمایاں ہے اور یہی خصوصیت مولانا کی شخصیت کو بلندی بخشتی ہے۔انھوں نے اپنی تحریروں کے زیادہ حصوں کو تاریخی موضوع بنایا اور انھوں نے ان تحریروں کے ساتھ انصاف بھی کیا۔

غبار خاطر کے ایک خط میں احمد نگر کی تاریخ اس طرح بیان کرتے ہیں:

''یہ شہر بھی ہندوستان کے ان خاص مقامات میں سے ایک ہے جن کے ناموں کے ساتھ صدیوں کی داستانیں وابستہ ہوگئی ہیں۔ پہلے یہاں بھینگر نامی ندی کے کنارے اسی نام کا گاؤں آباد تھا۔پندرھویں صدی مسیحی کے اواخر میں جب دکن کی بہمنی حکومت کمزور پڑ گئی تو ملک نظام الملک بھھیری نے علم استقلال بلند کیا اور بھینگر کے قریب احمد نگر کی بنیاد ڈال کر جنیر کی جگہ اسے حاکم نشین شہر بنا دیا''۔

(غبار خاطر۔ص 25،26)

ترجمان القرآن مولانا کا علمی شاہکار ہے اس تحریر کو بغور مطالعہ کریں تو ایسا لگتا ہے کہ مذہب دین اسلام اور تاریخ کا سنگم ہو اور دنیا اور تاریخ مولانا کے سامنے ہے۔ساتھ ہی ساتھ تاریخ اسلام مولانا کے سامنے روز روشن کی طرح پھیلی ہوئی ہے۔ہندوستان کی تاریخ سے متعلق مولانا آزاد کے خیالات میں بڑی وسعت اور گہرائی پائی جاتی ہے۔وہ تاریخ ہندوستان میں ایک تسلسل کا شدید احساس رکھتے تھے اور واقعات کو اسی تاریخ کے پس منظر میں دیکھنا اور دکھانا چاہتے تھے۔ وہ ہندوستان کی قدیم تاریخ کا موازنہ قدیم یونانی تہذیب سے کرتے ہیں۔مولانا کو ہندوستان کی اٹھارہویں اور انیسویں صدی کی تاریخ اور 1857 کی تحریک آزادی کی تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی۔مولانا کی تاریخی وسعت ہندوستان تک محدود نہ تھی انھیں عرب، مصر، ایران اور شام کی تاریخ میں بھی گہری دلچسپی تھی۔

مولانا آزاد کی وفات 22 فروری 1958 کو دہلی میں ہوئی۔ ان کی وفات سے قوم و ملت ایک عظیم رہنما سے محروم ہوگئی۔ جدید ہندوستان میں ان کی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور ان کا نام سنہری حرفوں سے لکھا جائے گا۔ مولانا آزاد کی خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں ہندوستان کا پہلا وزیر تعلیم مقرر کیا گیا اور ان کی قیادت میں ہندوستان نے تعلیمی میدان میں اہم ترقی کی۔

مولانا آزاد کا پیغام آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ ان کے دور میں تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کو تعلیم حاصل کرنے، جدید علوم و فنون سے آراستہ ہونے اور قومی یکجہتی کی بات کی۔ ان کا پیغام آج بھی ہماری رہنمائی فراہم کرتا ہے اور ہمیں مستقبل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کرتا ہے

ماخذ و منابع:۔

1 مولانا آزاد ایک مطالعہ: ڈاکٹر بشری رحمٰن، احاطہ کورٹ صاحب گورکھپور، 2005

2 امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد: سوانح حیات، انور دہلوی، مکتب اردو، دہلی

3 مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم۔سیرت شخصیت علمی اور علمی کارنامے، مولانا سید اکبر آبادی

4 مولانا آزاد: آزاد کی تقریریں، انور عارف، نیو تاج آفس، دہلی

5 مولانا ابوالکلام آزاد: تنقید و تبصرہ کی نگاہیں، ابو سید بزمی، اقبال اکیڈمی، لاہور

6 مولانا ابوالکلام آزاد: شخصیت سیاست پیغام، رشید الدین خان

7 مولانا ابوالکلام آزاد: مطالعہ مذاہب، پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی

8 مولانا ابوالکلام آزاد: شورش کاشمیری

9 مکاتیب مولانا ابوالکلام آزاد : ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہاں پوری، آزاد انسٹی ٹیوٹ، کراچی

10 متبرکات آزاد: غلام رسول مہر

11 غبار خاطر۔ مولانا ابوالکلام آزاد۔ مترجم محمد افسر رھبین' ناشر' انتشارات سعید، نوبت چاپ: اول، بنیاد ہند و افغانستان، کابل' 1392 خورشیدی

❐❖❐

Dr. Mahtab Jahan
Associate Prof.
Dept. of Persian
Delhi University
Delhi-110007

وسیم حسن راجا

نازک الملائکہ

عورت، شاعری اور آزادی کا فکری امتزاج

عہدِ جاہلیت سے لے کر آج تک عرب عورت نے عربی زبان کی خدمت، اس کی بقا اور اس کے جمالیاتی ورثے کے فروغ میں ہمیشہ نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ نثر ہو یا نظم، داستان ہو یا تخلیقی اظہار کی دیگر جہات میں عرب خاتون نے ہر دور میں اپنے فن اور احساسات سے ادبی منظرنامے کو زندگی بخشی۔ مختلف ادوار میں منعقد ہونے والے ادبی بازار اور محافل خواتین کے لیے اپنے فن کے اظہار اور ادبی قابلیت کے اعتراف کا روشن دروازہ ثابت ہوئے۔

انھیں تابناک ادبی شخصیات میں نازک الملائکہ کا نام نہایت وقار کے ساتھ لیا جاتا ہے، جنھوں نے کم عمری ہی میں اپنی فطری ذہانت، ادبی شعور اور شعری جدت کے ذریعے اپنا مقام بنایا۔ نازک الملائکہ وہ درخشاں ثقافتی شخصیت ہیں جنھوں نے بیسویں صدی میں شروع ہونے والی شعری تجدید کی تحریک کو نئی سمت عطا کی۔ آزاد نظم (شعر التفعیلہ) کے حوالے سے ان کا نظریہ اور اسلوب عراقی ثقافتی و ادبی زندگی پر گہرے اثرات چھوڑ گیا اور آج بھی اہلِ ادب، ناقدین اور شعرا کے درمیان بحث و تحقیق کا محور بنا ہوا ہے۔

ان کی متعدد نظمیں آج بھی اسی تازگی، توانائی اور فکری حرارت کے ساتھ زندہ ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ نازک الملائکہ کی زندگی، عربی زبان و ادب کے لیے ان کی گرانقدر خدمات، آزاد نظم کے فنی و جمالیاتی پہلوؤں کی وضاحت اور ادبی تخلیق و نقد میں ان کے مؤثر کردار کا جامع جائزہ پیش کرتا ہے۔ یہ مطالعہ بالخصوص آزاد نظم کی شعری صنعت کا ایک تحقیقی و تحلیلی مشاہدہ فراہم کرتا ہے، جس سے جدید عربی شاعری کے ارتقائی سفر کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

نازک الملائکہ عراق کی ان اولین تعلیم یافتہ خواتین میں سے تھیں جنھوں نے اپنی ثانوی اور جامعاتی تعلیم مکمل کی۔ وہ جدید دور کی اہم ترین عراقی اور عرب شعرا میں سے ایک ہیں۔ انھیں آزاد نظم (شعر التفعیلہ) کی علمبردار (رائدۃ) کے طور پر شہرت ملی، کیونکہ انھوں نے کئی صدیوں سے عربی ادب میں رائج کلاسیکی یا عمودی شاعری کے سانچے اور ساخت کو ترک کر کے آزاد نظم کی شکل کو اختیار کیا اور اسے رواج دیا۔

عمودی شاعری سے آزاد نظم کی طرف ان کے جھکاؤ نے کئی روایتی اصولوں کو توڑا، جس پر انھیں شدید بحث اور مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ تنقید صرف روایتی شعرا تک محدود نہیں تھی بلکہ ان کے اپنے خاندان نے بھی اس پر تحفظات کا اظہار کیا۔

شاعرہ نازک الملائکہ 1923 میں بغداد میں پیدا ہوئیں اور ایک علمی و ادبی گھرانے میں پرورش پائی۔ ان کی والدہ سلمیٰ عبدالرزاق خود بھی شاعرہ تھیں اور ان کے والد صادق الملائکہ ادیب اور محقق

تھے۔اس ماحول نے ان کی شاعری کی صلاحیت کو پروان چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا اور انھیں بہترین ثقافتی ماحول میسر آیا۔

انھوں نے 1939 میں ہائی اسکول سے گریجویشن مکمل کی اور بچپن ہی سے انھیں عربی، انگریزی، تاریخ اور موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ وہ فلکیات، وراثت اور کیمیا جیسے علوم کے مطالعہ میں بھی دلچسپی لیتی تھیں، جو ایک مضبوط ثقافتی پس منظر کی عکاسی کرتا ہے۔

ہائی اسکول کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد، انھوں نے دارالمعلمین العالیہ میں داخلہ لیا اور 1944 میں امتیاز کے ساتھ گریجویشن کی۔ 1949 میں انسٹی ٹیوٹ آف فائن آرٹس کے شعبہ موسیقی سے بھی فارغ التحصیل ہوئیں۔ 1950 میں انھوں نے انگریزی زبان وادب میں مزید مہارت حاصل کرنے کے لیے امریکہ کا سفر کیا اور وہاں سے ادبیات میں ڈگری حاصل کی۔

وہ عربی کے علاوہ انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور لاطینی زبانوں میں مہارت رکھتی تھیں۔ انھوں نے بغداد کی کالج آف ایجوکیشن سے عربی زبان میں لائسنس اور امریکہ کی وسکونسن یونیورسٹی سے تقابلی ادب میں ماسٹرز کی ڈگری حاصل کی۔ وہ 1965 میں بغداد میں منعقد ہونے والی عرب ادیبوں کی کانفرنس میں عراق کی نمائندگی کر چکی ہیں۔ انھوں نے جامعہ بغداد، جامعہ بصرہ اور جامعہ کویت میں بطور پروفیسر خدمات انجام دیں۔

وہ 1990 سے قاہرہ میں مقیم ہوگئیں اور وہاں ایک اختیاری تنہائی کی زندگی گزاری۔ 20 جون 2007 کو 83 سال کی عمر میں خون کے شدید دورے کے باعث قاہرہ میں وفات پائی اور وہیں خاندان کے ایک نجی قبرستان میں دفن ہوئیں۔

ادبی کام: ان کے شعری مجموعوں میں شامل ہیں: 'عاشقۃ اللیل' 1947، 'شظایا ورماد' 1949، 'قرارۃ الموجۃ' 1957، 'شجرۃ القمر 1965'، 'مأساۃ الحیاۃ وأغنیۃ للإنسان' 1977، 'الصلاۃ والثورۃ' 1978، 'یغیر ألوانہ البحر' متعدد بار شائع ہوا۔

ان کی تنقیدی کتابوں میں 'قضایا الشعر المعاصر'، 'التجزیئیۃ فی المجتمع العربی'، 'الصومعۃ والشرفۃ الحمراء'، 'سیکولوجیۃ الشعر'، 'الشّمس التی وراء القمۃ' وغیرہ شامل ہیں۔

عربی اور مغربی جامعات میں ان پر متعدد مطالعے اور مقالے لکھے گئے ہیں۔

آزاد نظم (الشعر الحر) کا ارتقاء اور خصوصیات

بیسویں صدی عربی ادب کے لیے ایک انقلابی دور کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی صدی میں عربی شاعری میں ایک نیا رجحان ابھرا جسے آزاد نظم یا 'الشعر الحر/شعر التفعیلہ' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ شاعری روایتی قصیدہ یا عمودی شاعری (الشعر العمودی) سے الگ ایک نئی طرزِ اظہار کی علامت تھی، جس نے روایت سے انحراف کرتے ہوئے شاعر کو اظہارِ ذات کی آزادی، بحر و وزن میں لچک، اور خیال کے بہاؤ کے مطابق شعر کہنے کی گنجائش دی۔

آزاد نظم میں شاعر ایک مکمل بحر یا متعدد تفعیلات کی بجائے ایک ہی تفعیلہ (بحر کا بنیادی جزو) کو نظم کی بنیاد بناتا ہے۔ اس میں مصرعوں کی طوالت مختلف ہوسکتی ہے؛ بعض مصرعے طویل اور بعض مختصر ہوتے ہیں، لیکن آہنگ اور معنوی تسلسل نظم کو مربوط رکھتا ہے۔ شاعر اپنی داخلی کیفیات، جذبات اور فکری تسلسل کے مطابق ہر سطر میں تفعیلات کی تعداد کا تعین خود کرتا ہے۔ یہی آزادی اس طرزِ شاعری کا جوہر ہے۔

آزاد نظم کے حوالے سے یہ بات اہم ہے کہ عربی شاعری میں تبدیلی کا یہ عمل اچانک نہیں ہوا۔ اس کی بنیادیں بیسویں صدی کے آغاز میں ہی پڑنے لگی تھیں، جب شاعری غنائی (Lyric) انداز سے نکل کر ڈرامائی (Dramatic) شاعری کی طرف مائل ہوئی۔ اس تبدیلی میں خلیل مطران، احمد شوقی، اور الأخطل الصغیر جیسے شعرا نے نمایاں کردار ادا کیا۔ خلیل مطران کو تو بعض ناقدین 'رائد الشعر العربی الحدیث' بھی کہتے ہیں، کیونکہ ان کے ہاں رومانویت، داخلی تجربے، اور انسانی احساسات کی ترجمانی پہلی بار واضح طور پر نظر آتی ہے۔

وزن اور قافیہ کی قدیم پابندیاں رفتہ رفتہ کمزور پڑنے لگیں۔ شاعری اب صرف الفاظ کی موسیقیت تک محدود نہ رہی بلکہ فکر، تجربے، اور اظہار کی گہرائی اس کا مرکزی نکتہ بن گئی۔ چنانچہ 'شعر

'التفعیلہ' میں وزن ایک تفعیلہ کی تکرار پر مبنی ہوتا ہے، نہ کہ دو مساوی مصرعوں کے درمیان تفعیلات کی برابری پر، جیسا کہ روایتی قصیدہ یا غزل میں ہوتا تھا۔

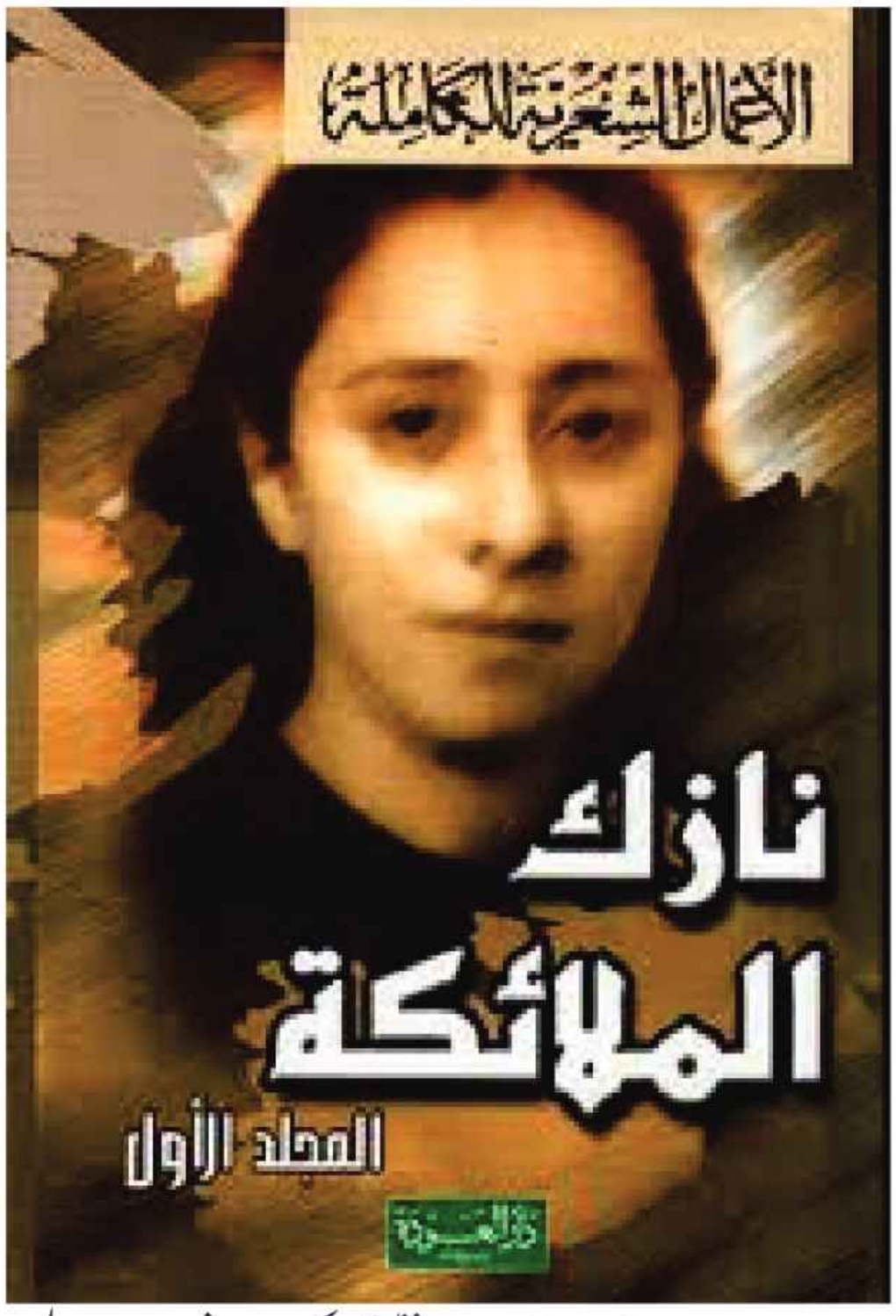

ادبی نقادوں کے نزدیک آزاد نظم کی فکری اور فنی جڑیں اندلسی موشحات (الموشحات الأندلسیۃ) اور زجل میں بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ موشحات میں شاعر معروف عربی اوزان کی سخت پابندی نہیں کرتا تھا، بلکہ آہنگی نظام (rhythmic pattern) کو بنیاد بنا کر الفاظ اور مصرعوں کی ترتیب طے کرتا تھا۔ یہی تصور بعد میں بیسویں صدی کے عرب شعرا نے ازسرِ نو دریافت کیا اور اسے شعر التفعیلہ کی صورت میں نیا روپ دیا۔

بعض محققین کا ماننا ہے کہ جدید عربی آزاد نظم کا آغاز بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کے اواخر میں ہوا۔ اس تحریک میں نازک الملائکہ، بدر شاکر السیاب، عبدالوہاب البیاتی، اور بلند الحیدری جیسے نام نمایاں ہیں۔

نازک الملائکہ کو عموماً اس صنف کی بانی سمجھا جاتا ہے، کیونکہ ان کی نظم 'الکولیرا' (1947) کو آزاد نظم کی پہلی مکمل مثال مانا جاتا ہے۔ یہ نظم مصر میں پھیلی ہوئی ہیضے کی وبا کے تناظر میں لکھی گئی تھی، جس میں شاعرہ نے آواز، آہنگ اور جذبے کی وحدت کے ذریعے انسانی المیے کو پیش کیا۔ اس نظم کی غیر روایتی موسیقیت اور بحر کی انفرادیت نے عربی شعری روایت میں ایک نئے باب کا آغاز کیا۔1

اس طرح آزاد نظم نے نہ صرف عروضی ڈھانچے کو بدلا بلکہ ادبی اظہار کے دائرے کو بھی وسعت دی۔ اب شاعر کے لیے ضروری نہیں رہا کہ وہ قافیہ اور بحر کی قید میں اپنے احساسات کو ڈھالے؛ بلکہ وہ فکر کی آزادی اور فن کی تازگی کے ساتھ شعر تخلیق کر سکتا ہے۔ اس نئی شاعری نے عربی ادب کو جدید عالمی رجحانات کے قریب کیا، اور رومانویت، وجودیت، سماجی احتجاج، اور داخلی شعور جیسے نئے موضوعات کے لیے راہ ہموار کی۔

نازک الملائکہ کی شاعری کی سب سے نمایاں خصوصیت شدید حساسیت اور گہرا کرب (Deep Anguish) ہے۔ ان کی رومانویت نے انھیں دنیاوی دکھوں اور انسانی المیوں پر حساس بنا دیا۔ وہ اپنی شاعری میں موت، تنہائی، مایوسی اور غم جیسے موضوعات کو اس طرح سے استعمال کرتی تھیں کہ یہ صرف ذاتی اظہار نہیں رہتا تھا بلکہ اجتماعی شعور کا حصہ بن جاتا تھا۔ یہ گہرا کرب ہی وہ داخلی تحریک ثابت ہوا جس نے انھیں شعری روایت کو توڑنے پر آمادہ کیا۔

نازک الملائکہ کی شاعری: وجودی کرب سے رجائیت اور عربی وحدت تک کا فکری و شعری ارتقا

نازک الملائکہ کی ابتدائی شاعری داخلی اضطراب، نفسیاتی شکست اور وجودی کرب (Existential Anguish) کی شدید کیفیت کی عکاس ہے۔ وہ اپنی نامراد آرزوؤں کو علامتی سطح پر فنا کر کے موت کے تصور میں ایک ایسی پناہ گاہ تلاش کرتی ہے جو اسے خوف، الم اور داخلی بے سمتی سے نجات فراہم کر سکے۔ رومانی رجحان کے زیرِ اثر، موت اس کے یہاں محض حیاتیاتی اختتام نہیں بلکہ ایک تطہیری اور مابعد الطبیعیاتی نجات کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔2

یہ تصور اس کے ابتدائی شعری متن میں بار بار سامنے آتا ہے، جہاں موت کو زندگی کے جبر، فریب اور اذیت سے فرار کی علامت کے طور پر پیش کیا گیا ہے:

أفلیس الموت فی میعۃ العمر
إذن نعمۃ علی الأحیاء
حین ینجو الحی الشقی من الخوف
ویفنی من واجبات الفناء
تارکًا ہذہ الحیاۃ وما فیہا
من الزیف والبؤس والأیتام 3

ان اشعار سے واضح ہوتا ہے کہ نازک الملائکہ کے نزدیک موت، رومانویت کے کلاسیکی تصور کے مطابق، ایک تطہیری قوت (Purifying Force) ہے جو انسان کو وجودی خوف اور سماجی المیوں سے نجات دلاتی ہے۔

نازک الملائکہ کی فکری تشکیل میں اس کے سماجی وتہذیبی ماحول کے ساتھ ساتھ یورپی رومانی شعرا، خصوصاً جان کیٹس، کا گہرا اثر نمایاں ہے۔ وہ کیٹس کو موت کا سب سے عظیم شاعر قرار دیتی ہے اور اس کے تصورِ حیات وممات کو اپنے شعری وجدان میں جذب کر لیتی ہے۔[3] تاہم اس فکری اثر پذیری کے ساتھ ساتھ ذاتی زندگی کے شدید سانحات بی ماں، دادا اور پھوپھی کی وفات بی نے اس کے شعور کو گہرے صدمے سے دوچار کیا۔ یہ سانحات اس کی زندگی کے ایسے مرحلے میں رونما ہوئے جب اس کی شخصیت ابھی فکری ارتقا کے عمل سے گزر رہی تھی، چنانچہ موت اس کے نزدیک ایک مجرد تصور کے بجائے ایک ہمہ گیر انسانی المیہ بن کر سامنے آئی۔

ان حالات کے نتیجے میں شاعرہ کے ہاں زندگی کی معنویت تقریباً معدوم ہوجاتی ہے۔ وہ اپنی تمام آرزوؤں کو قتل شدہ اور دل کو ایک مردہ وجود کے طور پر پیش کرتی ہے۔ قصیدہ قلبٌ میت" اس ذہنی کیفیت کا نہایت بلیغ اظہار یہ ہے:

نعم مات قلبی، أین أحزان حبی
وأین أمانیہ؟ وأین أغانیہ
حرارتہ أضحت رمادًا مہمشًا
وأحلامہ ذابت علی صدر ماضیہ 4

یہ اشعار نازک الملائکہ کی شاعری میں داخلی شکست، جذباتی جمود اور وجودی خلا (Existential Vacuum) کی علامت بن کر سامنے آتے ہیں۔

نفسیاتی، سماجی اور فکری دباؤ کے باعث نازک الملائکہ کی شاعری ایک طویل عرصے تک رومانی حزن، یاس اور انفرادی المیے کے محدود دائرے میں مقید رہی۔ اس کی ابتدائی تخلیقات میں حزنیہ آہنگ، رومانوی حسیت اور ذات کی مرکزیت غالب نظر آتی ہے۔ تاہم تیسرے شعری مجموعے 'قرارۃ الموجۃ' میں اس کی فکری جہت میں تدریجی تبدیلی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں، جہاں خواب آزادی اور امکان کے استعارے کے طور پر ابھرتے ہیں، اگرچہ شاعرہ بار بار ایک ساکت اور غیر متحرک حقیقت کی طرف لوٹ آتی ہے۔5

یہ کیفیت قصیدہ 'السفینۃ التائہۃ' میں علامتی پیرائے میں جلوہ گر ہوتی ہے، جہاں زندگی کو ایک بے کنار سمندر اور ذات کو بھٹکتی ہوئی کشتی سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ استعارہ شاعرہ کے فکری انتشار، مقصدیت کے فقدان اور وجودی بے سمتی کی بھرپور عکاسی کرتا ہے۔6

نازک الملائکہ کے شعری ارتقا کا فیصلہ کن مرحلہ اس وقت آتا ہے جب اس کی تخلیقی مسافت 'شجرۃ القمر' اور 'مأساۃ الحیاۃ' کے تیسرے حصے تک پہنچتی ہے۔ یہاں اس کی شاعری میں ایک نمایاں فکری تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ تاریکی اور رات کے استعارے، جو اس کے ابتدائی کلام میں غالب تھے، اب روشنی، امکان اور امید کے اشارات میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ یاس اور ناامیدی کے وجودی اندھیروں میں سرگرداں آواز اب رجائیت کی فضا میں سانس لیتی ہے۔

اسی مرحلے پر نازک الملائکہ کا ایمان باللہ اس کے فکری نظام میں مرکزی حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور اس کا تصورِ حیات ایک نئے اخلاقی اور اجتماعی شعور سے ہم آہنگ ہو جاتا ہے۔ وہ فردی کرب سے نکل کر اجتماعی دکھ درد کی طرف متوجہ ہوتی ہے، عرب دنیا کے مسائل کو اپنی شاعری کا موضوع بناتی ہے اور عربوں کی وحدت کو

ایک تہذیبی و تاریخی ضرورت کے طور پر پیش کرتی ہے۔ یوں اس کی

شاعری رومانوی انفرادیت سے نکل کر قومی اور اجتماعی شعور کی نمائندہ بن جاتی ہے۔7

الغرض، نازک الملائکہ جدید عربی شاعری کی ایک ایسی اہم اور باوقار آواز ہے جس نے یورپی ادبی تحریکات سے استفادہ کرتے ہوئے عربی شاعری کو فکری و فنی تجدید سے آشنا کیا۔ اس کی تخلیقی جرأت اور تنقیدی بصیرت نے عربی ادب کو عالمی ادبی تناظر میں ایک مضبوط مقام عطا کیا اور اسے دیگر عالمی ادبی روایتوں کے ساتھ ہم سطح اور ہم مکالمہ بنایا۔8

خلاصہ

نازک الملائکہ جدید عربی شاعری میں آزاد نظم (شعرِ تفعیلہ) کی فکری اور فنی تشکیل میں ایک بنیادی حیثیت رکھتی ہیں۔ انھوں نے آزاد نظم کو محض اسلوبی تجربہ نہیں بلکہ ایک منظم ادبی رویّہ اور فکری شعور کی صورت میں پیش کیا، جس نے عربی شاعری کو جدید سماجی، نفسیاتی اور فکری تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔

نازک الملائکہ کا موقف روایت اور جدیدیت کے مابین متوازن رہا؛ انھوں نے کلاسیکی عروضی نظام کی کلی نفی کے بجائے اسے داخلی موسیقیت اور معنوی وحدت کے تابع کیا، اور اس طرح آزاد نظم کو عربی شعری روایت کے فطری ارتقا کے طور پر ثابت کیا۔ ان کی تنقیدی تصنیف 'قضایا الشعر المعاصر' آزاد نظم کے جمالیاتی اور نظریاتی خدوخال متعین کرنے میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مزید برآں، نازک الملائکہ نے عربی ادب میں عورت کے تخلیقی اور فکری تشخص کو نئی جہت دی اور عورت کو ایک خود مختار تخلیقی شعور کے طور پر منوایا۔ مجموعی طور پر، ان کا ادبی کارنامہ اس حقیقت کی تصدیق کرتا ہے کہ آزاد نظم جدید عربی شاعری کے ارتقائی عمل کا ایک ناگزیر اور بامعنی مرحلہ ہے۔

حوالہ جات: References

1 عبدالعزیز المقالح، قراءات فی الشعر العربی الحدیث، دار العودۃ، بیروت، 1980م.

2 عبداللہ الغذامی، الحداثۃ فی الشعر العربی، بیروت: المرکز الثقافی العربی، 1985۔

3 نازک الملائکۃ، شظایا ورماد، بیروت: دار العودۃ، 1957۔

4 إحسان عباس، اتجاہات الشعر العربی المعاصر، بیروت: دار الشروق، 1998۔

5 نازک الملائکۃ، شظایا ورماد، سابق حوالہ۔

6 نازک الملائکۃ، قرارۃ الموجۃ، بیروت: دار العلم للملایین، 1957۔

7 شوقی ضیف، الفن ومذاہبہ فی الشعر العربی المعاصر، قاہرہ: دار المعارف، 1992۔

8 عبدالعزیز المقالح، قراءات فی الشعر العربی الحدیث، صنعاء: دار الحکمۃ، 2001۔

□□□

Dr. Waseem Hassan Raja
Assistant Prof.
Dept. of Arabic
Islamic University of Science & Techonology
Awantipora
Pulwama-192122 Kashmir (J & K)

شاذیہ عمیر

دیارِ مغرب کا اہم شاعر
عدیل زیدی

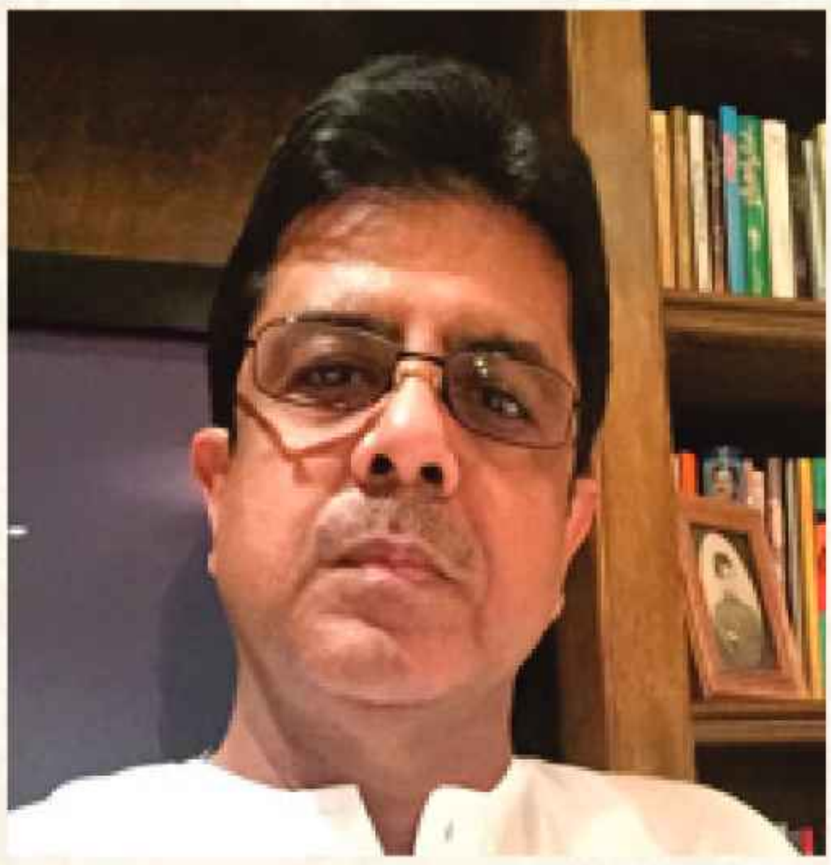

موجودہ دور میں اردو زبان وادب کے حوالے سے جو تشویش ،خدشات اور بے اطمینانی کا اظہار گاہے بہ گاہے ہو رہا ہے وہ اپنی جگہ درست ہے لیکن جب بات شاعری کی آتی ہے تو ادب کے منظر نامے پر اردو شعرا کی ایک طویل فہرست ہماری نگاہوں کے سامنے گردش کرنے لگتی ہے۔ جن میں دیار غیر میں بسنے والے وہ شعرا بھی ہیں جو اردو شاعری کا چراغ روشن کرنے میں منہمک ہیں اور روز افزوں ان کا یہ سفر آگے کی طرف گامزن ہے۔ ان میں سے ایک نام عدیل زیدی کا ہے، جن کا تعلق ممتاز علمی وادبی خاندان سے ہے۔ عدیل زیدی کے والد سید اختر رضا زیدی ہندوستان کے مشہور شاعر تھے اور رثائی ادب میں انھیں اہم مقام حاصل تھا۔ عدیل زیدی کے اب تک چار شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ ان کی پرورش والد کے زیر سایہ مذہبی، علمی وادبی ماحول میں ہوئی اور شاعری مذہبی احساسات بن کر مراثی کے روپ میں ان کے اندر سے نمودار ہوئی۔ ورثے میں ہی یہ اہلِ بیعت اور غم شبیر کے علم بردار ہیں، اس کا مکمل اظہار 'اذانِ مجلس' کی شکل میں منظر عام پر آیا۔ اس کے علاوہ 'چلتے چلتے'، 'کہاں آ گئے ہم'، اور قرضِ جاں تک آتے آتے ان کا فن اپنے عروج پر پہنچ گیا اس مجموعہ کلام میں شامل حمد، نعت، منقبت، نظمیں اور غزلیں اس کا بین ثبوت ہیں۔

عدیل زیدی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک میں قیام پذیر ہونے کے باوجود اپنی سرزمین، اپنی جڑ سے یہ کبھی الگ نہیں ہوئے۔ بظاہر تو ان کا مادی وجود دیار غیر میں سانس لے رہا ہے لیکن روح کی سطح پر آج بھی وہ خود کو دیار مشرق کا ہی باشندہ سمجھتے ہیں اور اپنی مٹی کی طرف مراجعت کا یہ عمل گاہے بہ گاہے ان کے اشعار میں جھلکتا رہتا ہے۔

شعر دیکھیے:

میں دریا پار کرنا چاہتا ہوں
ہیں سارے لوگ دریا پار میرے

کوئی پہچان اور ملال نہ تھا
اس سے بڑھ کر کوئی زوال نہ تھا

اپنی شناخت اور اپنے وجود کی تلاش انھیں پلٹ کر ماضی کی طرف مڑنے کے لیے مجبور کرتی ہے۔ دراصل اپنی زمین سے انسان کا رشتہ ماں اور بچے کا رشتہ ہے۔ زمین ایک ماں کی طرح ہے جس کے آنچل کی گھنی چھاؤں میں انسان پروان چڑھتا ہے اور اس کی دودھیا شاخ سے لپٹ کر اسے طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عدیل زیدی ماں سے جدا ہوئے تو بے ساختہ نوکِ زباں سے یہ شعر آنسو کی طرح ٹپک پڑا:

میں اس سے قیمتی شے کوئی کھو نہیں سکتا
عدیل ماں کی جگہ کوئی ہو نہیں سکتا

روٹی اور کپڑے کے بعد تیسری ضرورت کسی انسان کے لیے اس کا گھر ہے جہاں وہ سکون وراحت کی سانس لیتا ہے اور اس مقام پر آ کر تمام رنج وکلفت بھول جاتا ہے۔لیکن موجودہ عہد، شورش وبے کلی کا ایسا رزم نامہ ہے جس نے باہر تو باہر گھر کے سکون کو بھی غارت کر دیا ہے:

اپنی قسمت کہاں ہے پرکھوں سی
گھر نہیں یہ مکان ہے صاحب

ہجرت کے درد کو افتخار عارف نے بھی گھر اور مکان کی تمثیل کے ذریعے نہایت کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے:

مرے خدا مجھے اتنا تو معتبر کردے
کہ جس مکان میں رہتا ہوں اس کو گھر کردے
میں اپنے خواب سے کٹ کر جیوں تو میرے خدا
اجاڑ دے میری مٹی کو درد بدر کردے
میں زندگی کی دعا مانگنے لگا ہوں بہت
جو ہوسکے تو دعاؤں کو بے اثر کردے

کم وبیش دریارِ غیر میں بسنے والے تمام مہجری ادبا وشعرا نے اپنے لاشعور میں بسے آباؤاجداد کی وراثت کو فراموش نہیں کر پائے۔بظاہر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ پرائے دیس میں وہ مادی آسائش سے پُر زندگی سے مطمئن وسرشار ہیں لیکن ان کی تخلیقات ان کی روح کے کرب کو سطح پر لے آئی ہے۔عدیل کہتے ہیں:

شکم کی آگ بجھانے یہاں چلے آئے
کہاں کے لوگ تھے ہم سب کہاں چلے آئے
سبھی سے رکھا تعلق نگر نگر ٹھہرے
سکوں نہ گھر پہ ملا جب تو در بدر ٹھہرے
سکون جن کو ملا وہ تو اپنے گھر ٹھہرے
ہم ایسے لوگ زمانے میں دربدر ٹھہرے

زندگی سیدھی لکیر کا سفر نہیں ہے بلکہ بار بار اپنے کل کی طرف لوٹنے کا عمل بھی جاری رہتا ہے۔ یوں دائرہ در دائرہ وقت کے پھیلاؤ میں انسان سفر کرتا رہتا ہے اور آخر کار وہیں پہنچتا ہے جہاں سے اس کے سفر کا آغاز ہوا تھا:

اڑی تھی خاک جہاں سے وہیں پہ جانا تھا
سفر کہاں کا میاں اور مسافتیں کیسی

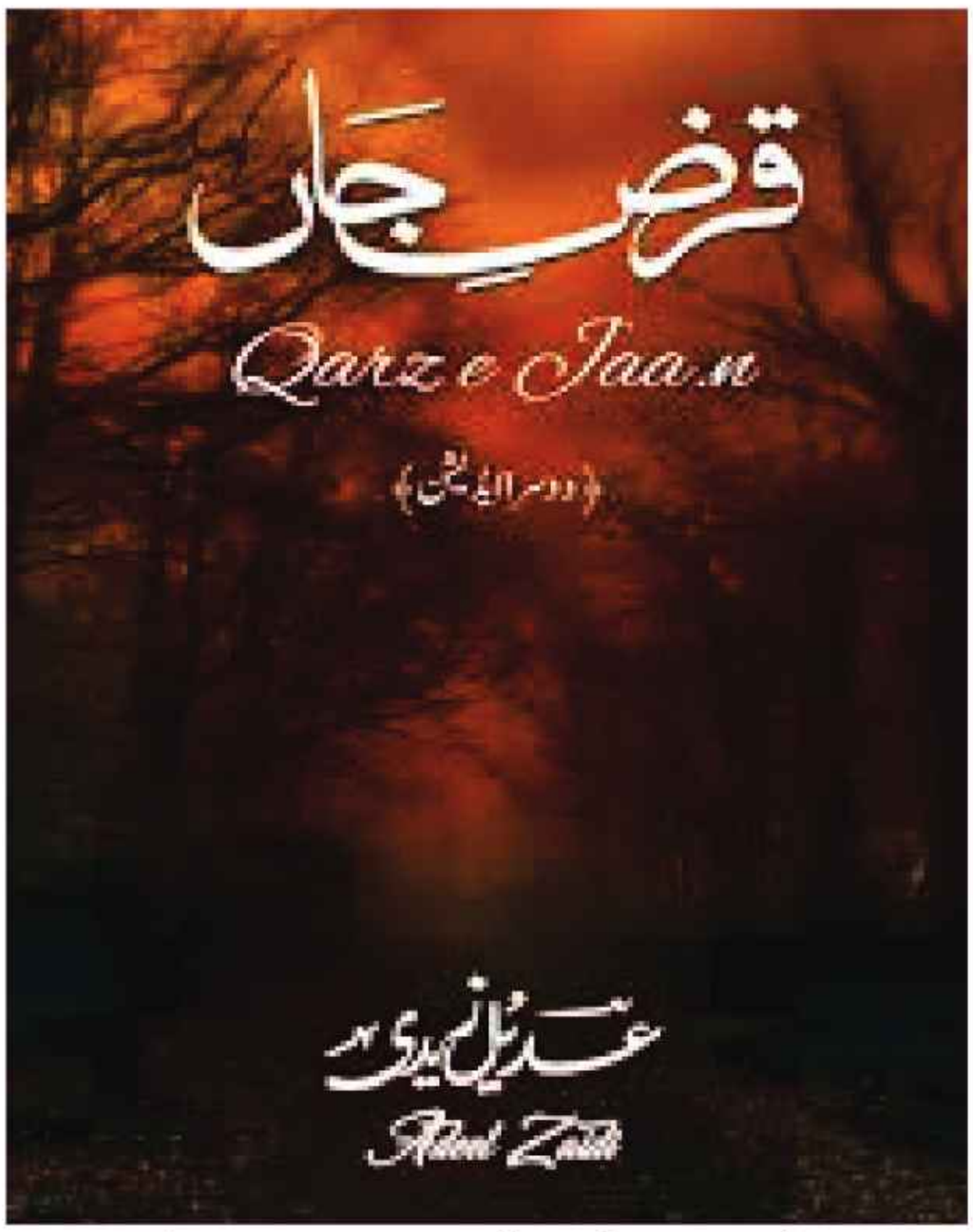

عدیل کی شاعری کا کینوس محض ہجرت اور اس کے کرب تک محدود نہیں بلکہ اس میں وہ تمام مسائل شامل ہیں جو موجودہ عہد میں انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ سیاست کی ریاکاریاں، مظلوم وبے بس کی پکار، لوگوں کا منافقانہ رویہ، سماجی نابرابری، جنگ کی ہولناکیاں، غرض مغرب کی پرتعیش زندگی میں سانس لینے کے باوجود عدیل کی شاعری محض اکہری اور ظاہر پرستی کے غبار میں سمٹ کر نہیں رہ گئی بلکہ جلتے سلگتے منظر ہمیشہ ان کی نگاہوں میں رہے جنھیں اکثر اونچے محلوں کی دیواریں ذہن ودل تک پہنچنے نہیں دیتیں۔ اشعار دیکھیے:

اس کی تو ایک بھی سرخی میں نہیں خون کا رنگ
یہ مرے شہر کا اخبار نہیں ہوسکتا
کتنے بچپن تھے جو محروم جوانی ہی رہے
اور اس بستی میں بوڑھوں پہ جمال آتا رہا

غزلوں کے ساتھ ساتھ نظموں پر بھی عدیل یکساں عبور رکھتے ہیں اور اس میں بھی عصری حسیت پوری طرح نمایاں ہے۔ اس کی مثال نظم سانحۂ نیوزی لینڈ اور نظم 'البانیہ' ہے مزید ان کی ایک اور نظم 'پہچان' ہے جو جشنِ آزادی پر لکھی گئی ہے۔ نظم دیکھیے:

آج ہم جشن مناتے ہیں کس آزادی کا؟
پہلی آزادی جو ورثے میں ملی تھی ہم کو
یا وہ آزادی جو اک دوسری ہجرت سے ملی
آج نصف صدی بعد
اس بستی میں
جو نئی نسل جنم لیتی ہے
اپنی نسلوں کا حوالہ بن کر
اپنے پرکھوں کا پتہ دیتی ہے
اس کی رسموں سے ملا دیتی ہے

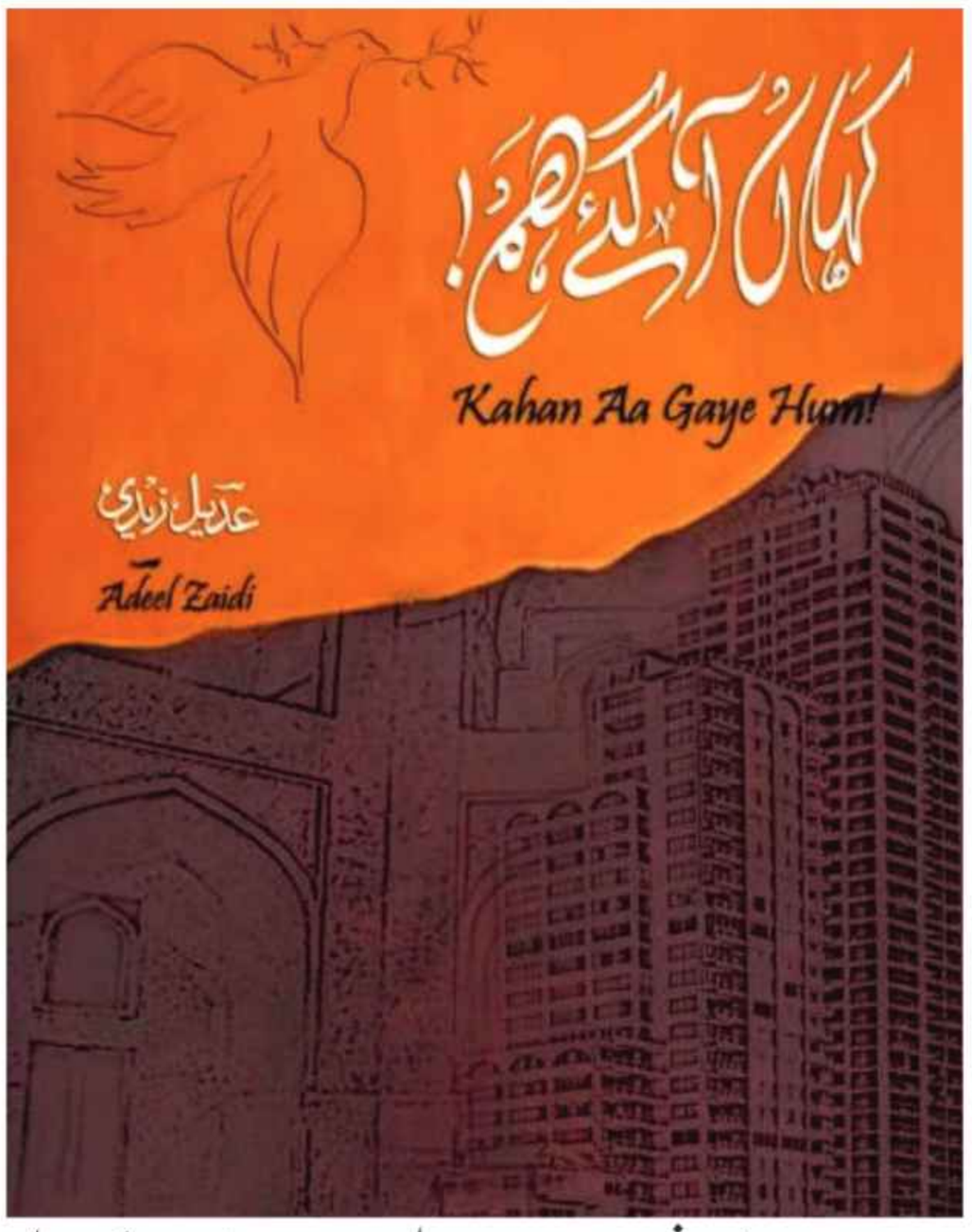

شاعری چونکہ انھیں وراثت میں ملی ہے۔ ان کے والد بھی اعلیٰ پایے کے شاعر تھے اور سارے بھائی بھی فطری شاعر ہیں لہٰذا عدیل کے لیے شاعری ذہنی مشقت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ خودرو پودے کی طرح ان کے اندر پروان چڑھتی رہی اور پھر صفحۂ قرطاس پر اترنے لگی۔ پہلے مجموعہ کلام 'چلتے چلتے' سے جو ان کا سفر شروع ہوا تھا وہ 'کہاں آ گئے ہم' 'اذانِ مجلس' اور 'قرض جاں' تک آتے آتے پختہ اور بالیدہ ہو گیا۔ نعت، منقبت، آزاد نظموں کے ساتھ ساتھ غزلوں کا وقیع سرمایہ اس کا ثبوت ہے۔ عدیل اگر چاہتے تو زندگی کی نیرنگیوں اور گہما گہمی میں گم ہو کر آرام سے شب و روز بسر کرتے لیکن وہ ایسے لوگوں میں شامل نہ ہو سکے اور ان کی بے قرار روح نے سوالوں کے ایک لامتناہی جنگل میں انہیں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیا۔

پیرزادہ قاسم عدیل کی شاعری کے بارے میں فرماتے ہیں کہ:

''وہ نہ صرف زندگی کی سچی تصویر دیکھ اور دکھا سکتا ہے بلکہ زندگی کی تفسیر اور تفہیم بھی کر سکتا ہے۔ تخلیقی سطح پر نمو پذیری اس کے فکری منظر نامے کو اور بھی خوشنما بنا دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری روایت سے جڑی ہونے کے باوجود کہنگی کی شکار نہیں ہو سکی۔ اہم بات یہ ہے کہ عدیل نے نہ صرف اپنی پہچان کو پالیا بلکہ اُسے زندگی اور وقت کی بھی اچھی شناخت ہے۔'' [قرض جاں، عدیل زیدی، تاثرات پیرزادہ قاسم، ص 31، مرکزی پبلیکیشنز، دہلی، 2021]

شاعر کو بے اطمینانی اس لیے بھی ہے کہ علم و ہنر والوں کو یہاں کوئی پوچھنے والا نہیں بلکہ وہ لوگ مسند نشیں ہیں جو نااہل ہیں:

نہ علم و فن ہی کسوٹی نہ تجربے سے غرض
عجیب قحطِ ہنر ہے ہنر کے ہوتے ہوئے

موجودہ عہد کی صارفیت نے رشتوں کی حرمت پر سوال کھڑا کر دیا ہے۔ اب نہ وہ ایک دوسرے سے قربت ہے اور نہ ہی انسیت۔ اس کھوئے ہوئے رشتوں کی بازیافت کا عمل عدیل کے یہاں بہت توانا ہے۔ کیوں کہ یہی رشتے انسان کو انسان سے جوڑے ہوئے ہے۔ مغرب کی مادیت سے اوپر اٹھ کر عدیل مشرق کی روحانیت کو حرز جاں بنائے ہوئے ہیں۔ ان کے نزدیک ایک انسان کا انسان سے محبت ہی کا رشتہ اصل سرمایۂ حیات ہے باقی سب فریب نظر ہے:

جارہا ہے پھر کوئی لوٹ کر نہ آنے کو
اس سفر کا مقصد تو عمر بھر رلانا ہے
کب تلک رہیں تنہا زندگی کے میلے میں
اک طرف محبت ہے اک طرف زمانہ ہے
زندگی بھر اس کے ملنے کا خیال آتا رہا
حل نہ جس کو کرسکیں وہی سوال آتا رہا
اسے خلوص کی گرمی نہ موم کرپائی
ملایا ہاتھ بھی دل بھی ملاکے دیکھ لیا

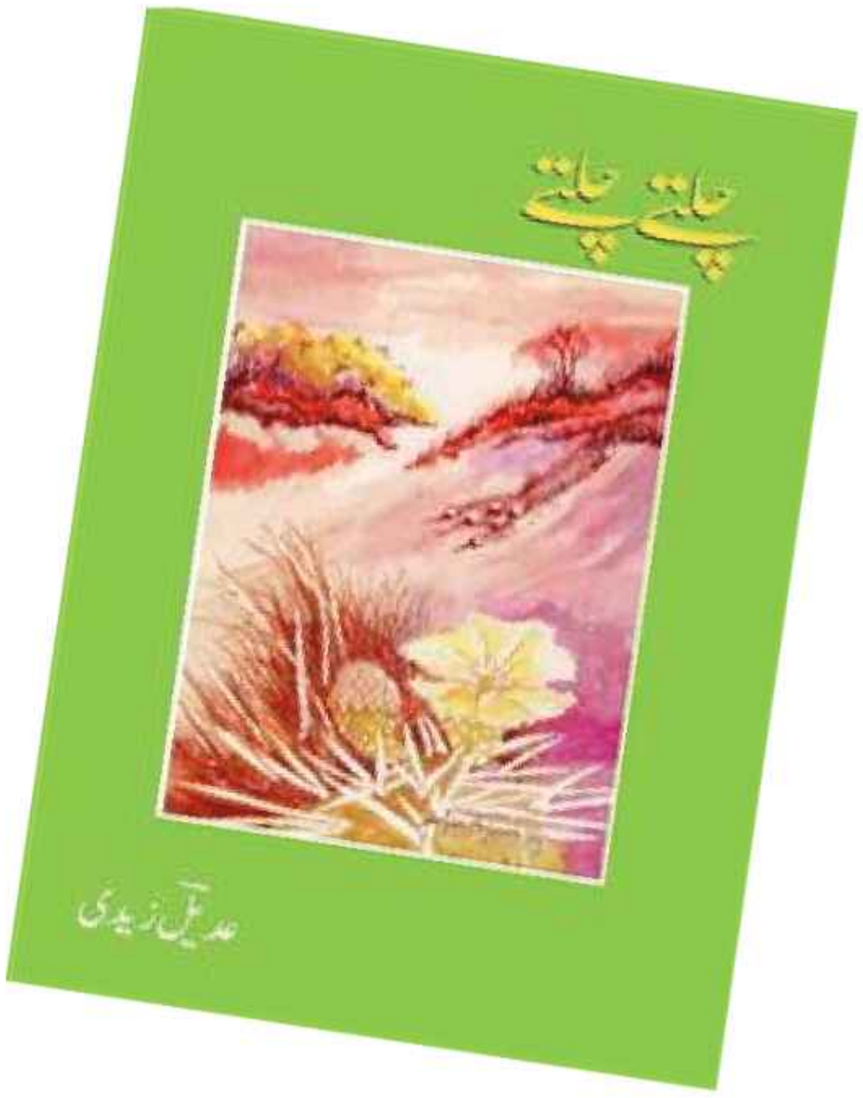

عدیل زیدی قدرت کی طرف سے بخشی ہوئی زندگی کو ایک بہت بڑی نعمت تصور کرتے ہیں اور دکھ اور سکھ دونوں کو اس کا روپ سمجھ کر قبول کرتے ہیں لیکن انھیں اس بات کا عرفان بھی ہے کہ یہ زندگی بہت مختصر ہے۔ چھوٹے سے عرصے میں نفرت کے لیے انسان نہیں پیدا کیا گیا۔ نظم 'زندگی' میں کہتے ہیں:

یہ زندگی ایک دائرہ ہے
دائرے میں رنگ بھر دو
محبتوں کے
صداقتوں کے
ہاں یاد رکھو
یہ رنگ وہ ہیں
جو دائرے میں اگر ہوں یکجا
تو دائرے کو امر یہ کردیں
ہاں یاد رکھو
یہ زندگی ایک دائرہ ہے
کبھی یہ روشن، کبھی اندھیرا
کسی نے دیکھا نہ اس کا چہرہ

اس طرح انھوں نے زندگی کے پل پل بدلتے روپ کو اپنی نظموں اور غزلوں میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ پرت در پرت مکروفریب کے غلاف میں لپٹی ہونے کے باوجود وہ زندگی کے اصل چہرے کو اپنے وجدان سے دیکھ لیتے ہیں اور اس کی معصومیت، نرمی وشادابی کو محسوس کرلیتے ہیں اور یہ ان کا اہم وصف ہے۔ خدا تو انسان کے دلوں میں بستا ہے اس لیے وہ کسی کا دل دکھانا بڑا گناہ سمجھتے ہیں۔

مغرب کی سرزمین پر اردو زبان کا چراغ جلانا خود میں ایک بڑا کام ہے جو عدیل بخوبی کررہے ہیں۔ صاف اور سادہ زبان میں نئی تاثیر وتازگی پیدا کرنا کسی شاعر کا اہم کام ہے۔ عدیل ان معنوں میں اہم شاعر ہیں کہ انھوں نے کسی مشکل لفظیات وتراکیب کا استعمال نہیں کیا اس کے باوجود ان کی نظموں اور غزلوں میں ایسی نغمگی اور پرکاری ہے کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے اپنے کلاسیکی سرمایے سے استفادہ تو انھوں نے کیا ہے لیکن اپنی راہ خود بنائی ہے۔ مقفی ہو یا آزاد شاعری اپنے تجربات ومشاہدات کو وہ پوری ایمانداری وسچائی کے ساتھ قاری کے رو بہ رو پیش کردیتے ہیں، جس میں زندگی کا دکھ درد بھی ہے، خواب کی سرزمین بھی اور آنے والے نئی دنیا کی بشارت بھی جس میں انسان کا انسان سے گہرا رشتہ قائم ہوگا۔

❐❖❐

Dr. Shazia Omair
Department of Urdu
University of Delhi
Delhi-110007

ڈاکٹر مہر افروز کی نگارشات

غضنفر اقبال

ڈاکٹر مہر افروز کی شخصیت کا زرین عنوان ادب وشعر سے ان کی غیر مشروط اور مخلصانہ وابستگی ہے۔ ان کا قلمی سفر ممارست وجستجو کے ساتھ خوب سے خوب تر انداز سے جاری ہے۔ وہ تصنیفی وتالیفی زندگی کی ہمہ گیری اور فعالیت کے ساتھ ساتھ فلاحی، سماجی اور رفاہی کاموں سے خاصی دلچسپی رکھتی ہیں۔ مہر افروز کی نگارشات کا راقم تحریر نے بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ بلاشبہ ان کی لکھت قاری کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔

ڈاکٹر مہر افروز کا اپنے والد گرامی قدر حضرت محمد یعقوب خان آزاد مرحوم ومغفور پر تحریر کردہ خاکہ والہانہ شیفتگی اور جذباتی لگاؤ کا اظہار یہ ہے۔ خاکے کے مطالعے سے مہر افروز کے والد محترم کے کردار کی عظمت قاری کے ذہن وقلب پر نقش ہوتی ہے اور اُن کی مومنانہ زندگی اور اخلاق کو اپنانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ خاکے سے مہر افروز نے مجموعی طور پر یہ تاثر دینے کی کامیاب مساعی کی ہے کہ ان کے والد بزرگ وار نے ملتِ اسلامیہ کے اندر تعلیمی بیداری اور دینی شعور بیدار کرنے کی مقدور بھر کاوش کی تھی۔ ان کی شخصیت کے امتیازی صفات نرم خوئی، ملنساری، سادگی، خوش خلقی اور سحر گاہی تھیں۔ مہر افروز نے اپنے والد قبلہ کی دل آویز شخصیت کا ایک جامع مرقع قاری کے رو برو کیا ہے جس کے ہزار رنگ ہیں اور ہر ایک رنگ جدا جدا ہے:

''مربی انسان تھے۔ سب سے خلق اور حسنِ اخلاق سے ملتے۔ بغض وعناد نہیں تھا۔ نہ مسلکی اختلاف رکھتے ہمیشہ کہتے۔ بیٹا تمام انسان ایک خدا کی مخلوق ہیں سب سے محبت کرو۔ ہم آدم کی اولاد ہیں۔ ایک خدا کے بندے ہیں ایک رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا کلمہ پڑھنے والے۔ سب سے محبت کرو۔ یہ ہمیشہ سکھایا گیا اور ہم اس پر قائم رہے اور ہیں۔''

(بہ حوالہ کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص109)

مسٹر اردو حضرت مقصود صفدر علی شاہ حسنی مرحوم (1951-2020)

مہر افروز کے معنوی روحانی باپ اور مرشد گرامی قدر تھے۔ مرحوم سے مہر افروز نے انٹرویو لیا ہے۔ مہر افروز کے سوالوں اور حضرت قبلہ کے جواب سے مرحوم کی ہمہ جہت اور تہہ دار زندگی کا خوب صورت اور عالمانہ احاطہ ہوتا ہے وہ اخلاق وکردار کے بلند مرتبے پر فائز تھے۔ یہ انٹرویو مہر افروز کی مرحوم سے دیرینہ خلوص ومحبت کی ارفع مثال ہے۔ حضرت قبلہ عامتہ الناس سے ان الفاظ میں گویا ہوئے تھے:

''وہ صرف اور صرف اور ہر حالت میں اللہ کے حضور ہاتھ اُٹھائے۔ اس سے بڑھ کر عطا کرنے والا بھلا اور کون ہوسکتا ہے۔ اللہ کے حضور اُٹھے ہاتھ با برکت اور حسن وجمال میں اپنی مثال نہیں رکھتے۔ ڈٹ کر محنت کریں اور اس سے میسر آنے والی روزی کو اپنے لیے کافی سمجھیں۔ یاد رکھیں۔ حلال کا ایک لقمہ قارون کے خزانے سے کہیں بڑھ کر ہے۔''

(بہ حوالہ کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص204)

محترمہ شمع زیدی سے کیا گیا انٹرویو نئے فکری مباحث کا جنم داتا ہے۔ یہ انٹرویو مہر افروز کی عدم موجودگی میں ان کے ترتیب کردہ سوالات کو ظفر محی الدین نے شمع زیدی سے کیے تھے۔ یہ انٹرویو ان سنی، ان کہی اور اچھوتی باتوں کو بھی منکشف کرتا ہے۔ اردو زبان کے متعلق مہر افروز کے ایک سوال کے جواب میں شمع زیدی فرماتی ہیں:

''میرے خیال سے ہندوستان میں اُردو بولنے میں تو زندہ رہے گی مگر تحریر مر جائے گی۔''

(بہ حوالہ: کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص260)

مہر افروز کے دونوں انٹرویو بے خبری، باخبری کا روپ دھار لیتے ہیں۔ شعبۂ زندگی میں انٹرویو کی معنویت بڑھ گئی ہے۔ مذکورہ انٹرویو سے اصحابِ ملاقات کا ذہن و ضمیر شعور و لاشعور اور نفسیاتی وجدان روشنی میں آتے ہیں جس میں انٹرویو کار نے کمال دکھایا ہے۔

مہر افروز کو علمِ لسانیات سے بھی شغف ہے۔ انھوں نے ابراہیم عادل شاہ ثانی المعروف جگت گرو (1570-1627) کی معروف زمانہ تصنیف 'کتاب نورس' میں کنڑی الفاظ کی تفہیم کے تناظر میں خوبصورت مضمون زیبِ قرطاس کیا ہے۔ یہ مضمون مصنفہ نے نہایت عمدگی اور مہارت سے موثر اُسلوب میں پیش کیا ہے۔ مہر افروز طراز ہیں:

''کتاب نورس کی زبان وہ تصنع رکھتی ہے جو کہ عوامی زبان سے اوپر اٹھنے، شہنشاہی جلال رعب دبدبہ قائم رکھنے اور تمام اقوام کے لوگوں تک پہنچنے کی ایک ایسی کوشش ہے جس کے ذریعے وہ اس زبان کو زبان معلّٰی کا درجہ دینا چاہتا تھا۔ اس لیے بادشاہ نے اپنی کتاب نورس میں تمام زبانوں کے الفاظ ملا کر شعر کہنے کی کامیاب کوشش کی ہے جو کہ ایک بادشاہ کے شایانِ شان تھی۔''

(بہ حوالہ: کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص196)

مذکورہ مضمون ایک نئے لسانی عہد نامے کی تمہید ہے اور لسانی فہم کے نئے زاویئے وا کرتا ہے۔ یقینِ کامل ہے کہ مذکورہ مضمون سے شائقینِ لسانیات بھرپور استفادہ کریں گے۔ اس مضمون سے فاضل ادیبہ کی سنجیدگی اور لسانی دوستی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

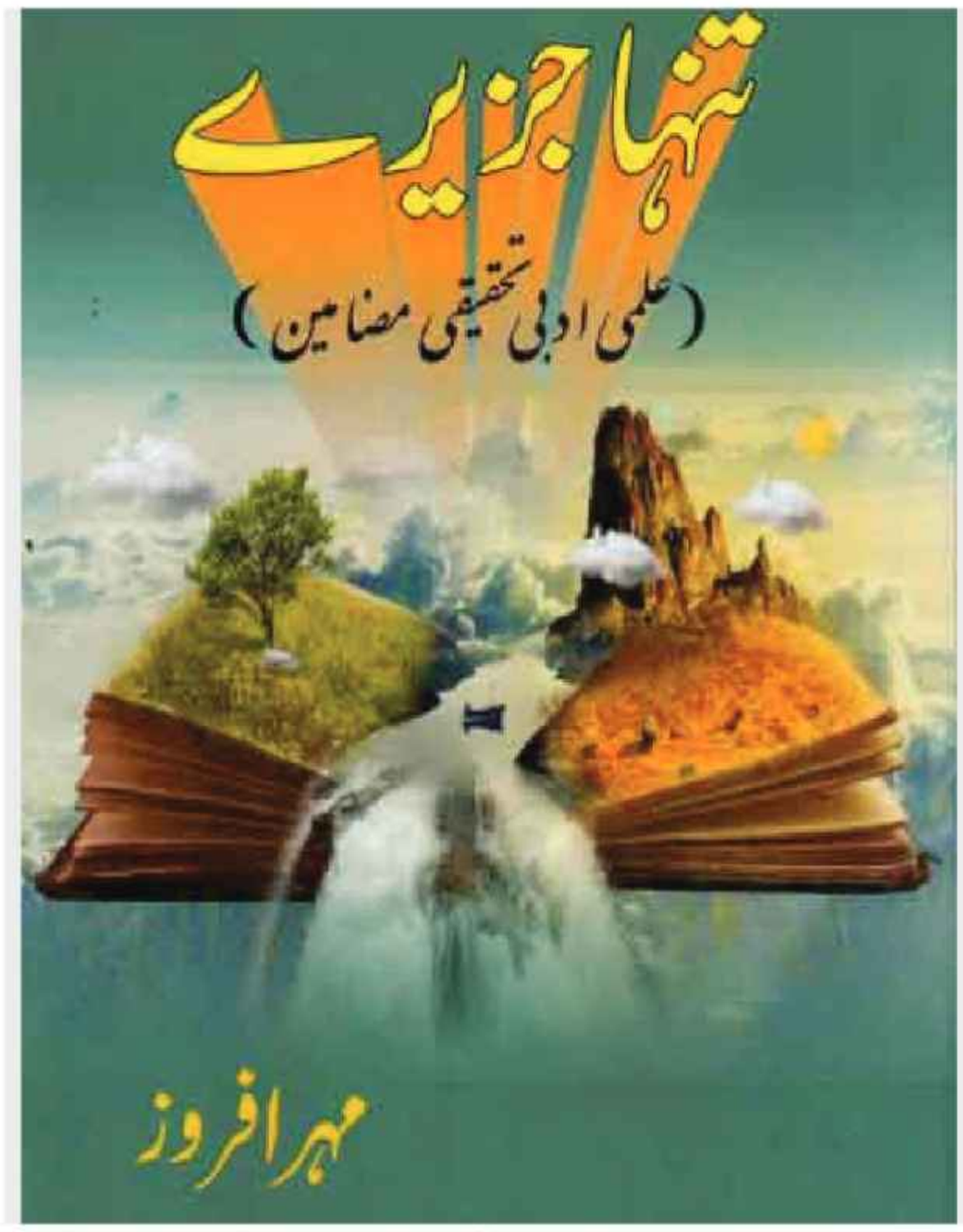

مہر افروز کے تین موضوعاتی مضامین ادب اطفال لکھنے کی تکنیک، جنوبی ہندوستان کی شاعری میں جذبۂ حب الوطنی اور قومی یک جہتی اور کرناٹک کے رباعی گو شعرا قابل توجہ ہیں۔ مصنفہ نے ان مضامین میں بڑی معلومات افزا باتیں لکھی ہیں۔ جس سے اُن کی جزرسی اور دیدوری مذکورہ مضامین میں جھلکتی ہے۔ یہ مضامین لائق مطالعہ غور طلب اور مسکت تردید ہیں۔ ان مضامین میں وہ لکھتی ہیں:

''اردو ہندوستان کی زبان ہے یہیں پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی ہے اردو صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے یہ قومی یک جہتی کا زندہ ثبوت ہے اور کہیں نہ مٹنے والا جاوداں اور وہ شیریں لہجہ رکھتی ہے جو سب کو لبھاتا ہے۔ ہماری تہذیب و ثقافت اس کے دم سے زندہ و پائندہ ہے۔ یہ زبان وفا داریاں وطن پر مر مٹنے کے جذبے سے سرشاری اور جانثاری کا عہد و پیمان جیسی نعمتیں بھی اپنے دامن میں رکھتی ہے۔''

(بہ حوالہ: کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص166)

اُردو کے دو عہد ساز شعرا نظیر اکبر آبادی (1735-1830)

اور جوش ملیح آبادی (1982 - 1894) کی شعر گوئی میں مصنفہ نے تصوف رنگ شاعری کو سادہ اور پر کشش انداز بیان میں پیش کیا ہے۔ جس کا اثر براہ راست قاری کے دل پر ہوتا ہے۔ ظاہری بات ہے کہ مہر افروز کی علم تصوف پر اچھی نگاہ ہے۔ اس لیے ان کے زیر بحث مضامین بڑے قیمتی اور مفید تر ہیں۔ انھوں نے دونوں شعرائے عظام کی سخنوری میں متصوفانہ لہر اور صوفیانہ تناظر کو پیش کرتے ہوئے حقیقت پسندانہ اور بے باک لہجے کا بھی اظہار کیا ہے:

''جوش کی جوانی واقعی رنگین تھی۔ لکھنو کا ماحول کوٹھے بازی اور شراب کی لت نے جوش کی شباب والی شاعری کو یہاں رنگینیاں عطا کیں، وہیں اردو ادب کو وہ لفظوں کا ذخیرہ دیا کہ جوش نے خود دعوی کیا کہ میں ایک ایک مضمون کو سو رنگ سے باندھوں اور ایک ہی جذبہ کو انہوں نے سو طریقہ اظہار بھی عطا کیے۔''

(بہ حوالہ کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص 12)

میں اقتدار جاوید کے دو مہربان دوست جوگندر پال (2016 - 1925) اور نند کشور وکرم (2019 - 1929) تھے۔ مہر افروز سے ان کے دیرینہ مراسم ہیں۔ مضمون بے حد معلوماتی، موثر اور دل چسپ ہے۔ اقتدار جاوید کی شاعری کو مہر افروز نے عشق کا استعارہ قرار دیا ہے:

''زندگی عشق ہے۔ عشق لا دوا درد ہے۔ یہ درد جس کا مقدر بنا وہ زندگی کا اصل سکندر رہے۔ جس نے اس عشق کا ذائقہ نہیں دیکھا اس کی زندگی بے معنی اور بے مقصد ہے۔ اقتدار جاوید کے اس عشق نے سجدے کا مزہ چکھایا رب سے بات کرنا سکھایا۔ سوٹ پہن کر نگاہ نیچی لئے اور پوری قوت و اقتدار میں رکھنے والا مرد کیسے جیتا ہے اور چلتا ہے اس سب کی تصویر کشی کی ہے۔ اپنے جذبۂ عشق میں موجود ریگ زاروں کی تپش کا احساس کرایا۔ آپ بھی عشقِ حقیقی کے سچے جذبات سے معمور اس شاعری کا مطالعہ کریں گے تو آپ کی آنکھیں ساون بھادوں ہو جائیں گی اور عشق کی لذت اور سوز و ساز کو آپ بھی ضرور محسوس کریں گے۔''

(بہ حوالہ کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص 222)

مہر افروز نے انل ٹھکر (2020-1994) کے دو ناول اوس کی جھیل اور پس اشک کے علاوہ صغیر رحمانی کے ناول ''تخمِ خون'' پر بڑی موثر اور جامع گفتگو کی ہے۔ ان تحاریر میں ادب کی چاشنی اور فکر ارجمند کی آمیزش ہے۔ ناول سے دلچسپی رکھنے والے قاری اور اہلِ قلم کے لیے تینوں مضامین کا مطالعہ از حد ضروری ہے کیوں کہ یہ مضامین انتہائی اہم اور وقیع تر ہیں۔ اقتباسات ملاحظہ کیجیے:

''ناول پس اشک اتنا مثالی ہے کہ کسی بھی یونی ورسٹی میں مثالی ناول کے طور پر شاملِ نصاب کیا جا سکتا ہے جو ناول کی تکنیک، پلاٹنگ، مکالمہ نگاری اور کردار نگاری کے بیانیہ پر کھرا اتر سکتا ہے۔''

(بہ حوالہ کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص 36)

''تخم خون کی حیثیت ممتاز اس لیے بھی ہے کہ یہ ایک سوچ کی تبدیلی کا مظہر اور ایک انقلابی پیغام کا پیش خیمہ ہے۔ جو

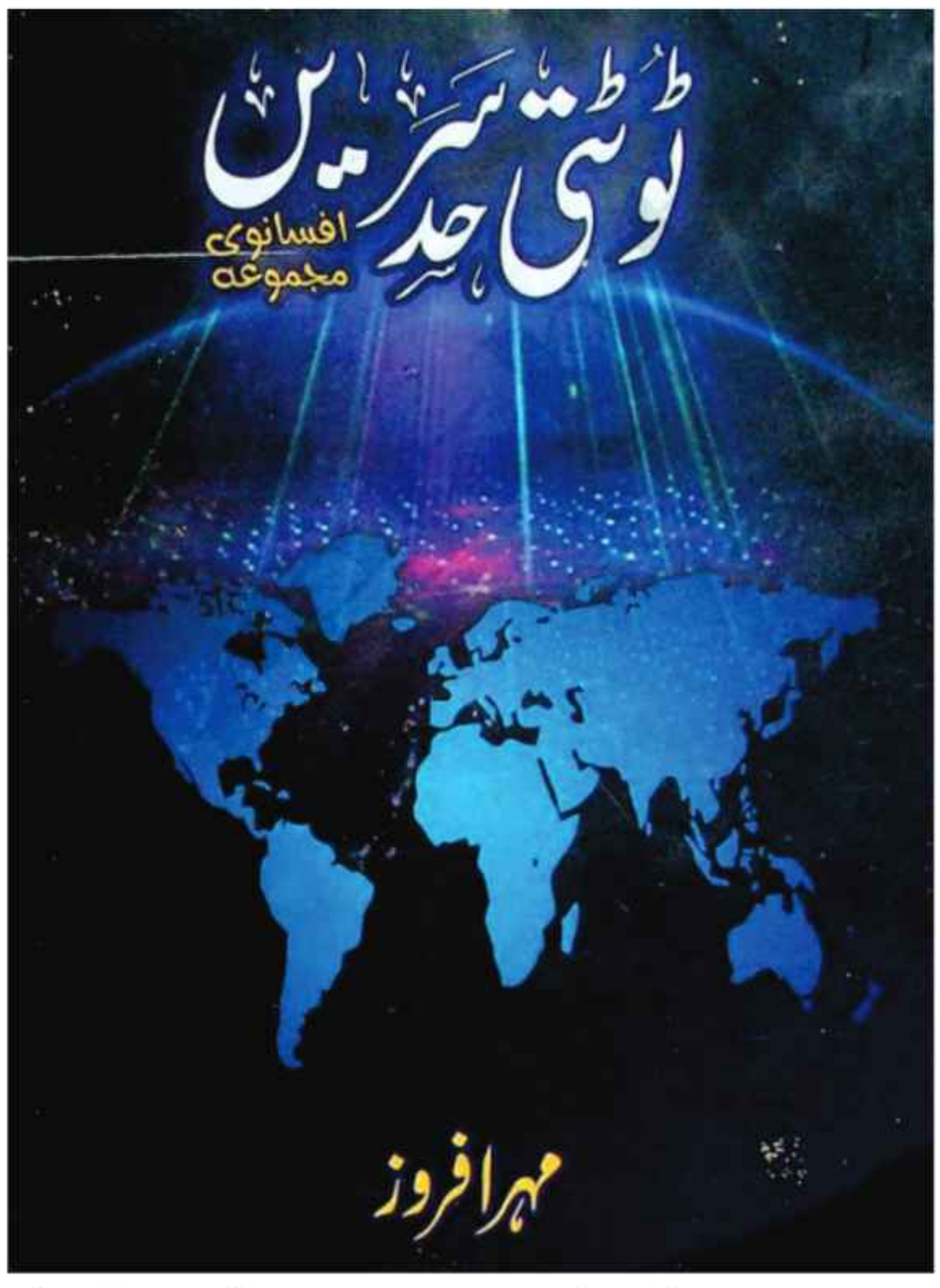

شعبۂ شاعری کے ذیل میں مہر امروز نے پاکستان کے مشہور شاعر اقتدار جاوید کی شعری کائنات پر بھی قلم فرسائی کی ہے۔ بھارت

ایک نسل کی ایک ذات کی اجتماعی سوچ کو نہ صرف منعکس کرتا ہے۔ بلکہ متاثر بھی کرتا ہے۔

(بہ حوالہ کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص 228)

قیصر نذیر خاور کی افسانوی خدمات کا مہر افروز نے جائزہ بہ طریق احسن لیا ہے۔ اس مضمون میں اُن کا واضح اور مدلل موقف ہے قیصر نذیر خاور کی افسانہ نگاری، مہر افروز کے الفاظ میں:

''قیصر نذیر خاور ہر اس انسان کے طرف دار ہیں جو کم زور، دکھی، تکلیف زدہ استحصال کا مارا ہے۔ ان کی ہر کہانی ایک دکھ ایک کسک ایک تڑپ کا اشاریہ ہے جو ان کی ذات کے دائرے سے نکل کر آفاقی درد اور احساس کرب کے سانچے میں ڈھل گیا ہے۔''

(بہ حوالہ کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص 243)

''ڈاکٹر مہر افروز نے پیش نامے بھی قلم بند کیے ہیں۔ پروفیسر چند را مولی نائیکر نے بہ زبان کنڑا سنسکرت زبان کے شاعر پنڈت راج جگن ناتھ پر ڈراما تحریر کیا ہے۔ جس کا ار دو روپ ڈاکٹر شکیلہ گوری خان نے کیا ہے۔ اس کتاب کا مبسوط اور مربوط پیش نامہ مہر افروز نے لکھا ہے۔''

ڈاکٹر مہر افروز نے پیش نامے بھی قلم بند کیے ہیں۔ پروفیسر چندرا مولی نائیکر نے بہ زبان کنڑا سنسکرت زبان کے شاعر پنڈت راج جگن ناتھ پر ڈراما تحریر کیا ہے۔ جس کا اردو روپ ڈاکٹر شکیلہ گوری خان نے کیا ہے۔ اس کتاب کا مبسوط اور مربوط پیش نامہ مہر افروز نے لکھا ہے۔ پیش نامے میں ڈراما کے متعلق مہر افروز نے منطقی استدلال اور جامعیت کو ملحوظ خاطر رکھا ہے جس سے اس کی معنویت دو چند ہوگئی ہے۔

شموئل احمد (1945 - 2003) اردو فکشن کے ممتاز ترین فرد بشر تھے۔ ان کی حین حیات 'کعبہ میرے پیچھے' کے زیر عنوان ایک کتاب زیر ترتیب تھی جس کا بارِ امانت ڈاکٹر محمد غالب نشتر نے اپنے سر پر لیا تھا۔ پتا نہیں کیوں یہ کتاب اشاعت سے محروم رہی۔ ڈاکٹر مہر افروز نے اپنے اس پیش نامے میں شموئل احمد کے افسانوی سفر پر اپنی رائے گرامی اس طرح درج کی ہے:

''شموئیل احمد کا ہر افسانہ ایک درد ایک احساس اور ایک پل کا استعارہ ہے جو صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ مگر قاری کو کہیں بھی نہیں لگتا کہ وہ استعاریت اور جدیدیت میں ڈوبی کوئی تحریر پڑھ رہا ہے۔''

(بہ حوالہ کتاب تنہا جزیرے۔ مہر افروز۔ ص 7)

ڈاکٹر محترمہ مہر افروز کی نگارشات کا جائزہ اس بات کو نمایاں کرتا ہے کہ ان کی عبارت میں روانی اور بہاؤ کا دریا موجزن ہے۔ ان کی زبان نہایت سادہ و شگفتہ اور روز مرہ کے مطابق ہے۔ انھوں نے اپنی تحریرات میں جن تاثرات اور خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بڑے موثر اور سبق آموز ہیں۔ مہر افروز اپنی تحریروں میں جو بات رقم کرتی ہیں ہر پہلو اور ہر زاویے سے اس کی جزئیات کا احاطہ بہ خوبی کرتی ہیں۔ ان کی تحریر میں مواد استدلال و استناد کے لحاظ سے لائقِ تحسین اور قابلِ مطالعہ ہیں۔ قاری کی نفسیات کا جس قدر پاس ولحاظ مہر افروز کی تحریروں میں ملتا ہے وہ دوسری خواتین اہلِ قلم کے ہاں نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہے۔ ظاہر ہے پیش نگاہ نگارشات مہر افروز کی ہیں وہ اخلاص و ہمدردی کا پیکر اور نہایت خدا ترس و تصوف پسند خاتون محترم ہیں۔ وہ اپنے شناساؤں، معاصرین، تلامذہ اور اہل قلم سے گویا ہوتی ہیں۔

اک نظر دیکھ لے، پھر سے چرالے نظریں
عکس بن کر تیری آنکھوں میں ٹھہر جاؤں گی

❐❖❐

Dr. Ghazanfar Iqbal
"Saiban" Zubair Colony
Hagange Cross Ring Road
Gulbarga-585104(K.S)
Mob Phone: 9945015964

اکیسویں صدی کے اردو افسانوں میں نسوانی حسیت

عرشیہ جبین

تانیثیت عربی زبان کے لفظ تانیث سے مشتق ہے۔انگریزی میں اسے Feminsm کہتے ہیں۔جو لاطینی لفظ Femina کا مترادف ہے۔فیمینزم کے معنی تحریک نسواں یا نظریۂ حقوق نسواں کے ہیں۔اس تحریک کا مقصد خواتین کے ساتھ ہورہے جبر واستحصال کے خلاف اعتدالی رویہ سے آواز اٹھانا،سماجی ،اخلاقی ،تعلیمی اور اقتصادی بنیادوں پر جنس کی تخصیص کے برخلاف برابری قائم کرنا، خواتین کے ساتھ ناروا سلوک،جنسی استحصال ،غیر مساویانہ حقوق، منفقانہ اخلاقی سلوک ،فرسودہ خاندانی رشتوں اور معاشرتی اقتدار کے بارے میں آگہی پیدا کرنا ہے۔

اکیسویں صدی میں جن افسانہ نگاروں نے تانیثی فکر کو اپنا کر افسانے لکھے ان میں وہ خواتین بھی ہیں جو بیسویں صدی کی آخری دہائی سے لکھ رہی ہیں اور انھوں نے اکیسویں صدی میں بھی اپنا سفر جاری رکھا ان میں ذکیہ مشہدی،تبسم فاطمہ،ترنم ریاض،غزال ضیغم اور وغیرہ کے نام امیت رکھتے ہیں اور وہ افسانہ نگار جو اکیسویں صدی سے لکھ رہی ہیں ان ثروت خان،شائستہ فاخری،تسنیم فاطمہ،صادقہ نواب صحر اور کہکشاں پروین،زیب النسا،شبانہ رضوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

ان خواتین افسانہ نگاروں میں خواتین کے اہم مسائل کے علاوہ سیاسی ،معاشی ،سماجی ،تہذیبی ومعاشرتی مسائل کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔اس کے علاوہ زمانے کی ترقی اور گلوبلائزشن کے دور میں تمام عالمی مسائل کو بھی اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔

خصوصاً تانیثی فکر کے تحت خواتین افسانہ نگاروں نے متعدد افسانے بھی احاطہ تحریر میں لائی ہیں۔

نسوانی فکر سے وابستہ افسانہ نگاروں میں ذکیہ مشہدی کا نام اہم ہے۔2000 کے بعد شائع ہونے والے ان کے افسانوی مجموعے 'صدائے بازگشت'(2003) اور 'نقش ناتمام'(2008) اور 'یہ جہاں رنگ و بو' (2012) ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں سماجی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی مسائل کو موضوع بنایا ہے۔خواتین کے مسائل اور معاشرتی زندگی کے بے شمار مسائل پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔لڑکیوں کے تئیں سماج کی تخصیص ،دوہرے معاشرتی رویئے ، والدین کی لاپرواہی ، سماج کی عدم توجہی اور بے جا سلوک کی وجہ سے خواتین جن ذہنی الجھنوں ،اور نفسیاتی کیفیات میں مبتلا ہیں ان کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے۔افسانہ ''تھکی ہوئی عورت میں'' شادی سے پہلے مرد کی محبت کا سلوک اور شادی کے بعد اسی مرد کے رویے میں تبدیلی ، بیوی کے تئیں عدم توجہی اور نا زیبا سلوک کی وجہ سے عورت پر کیا گزرتی ہے اس کی بہترین تصویر کشی کی گئی ہے۔افسانہ 'تھکے پاؤں' میں ماں باپ کی لاپرواہی اور خود غرضی سے رتنا اور صوفیا کو جن حالات ومسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اس کو موضوع بنایا گیا ہے۔اس افسانے میں رتنا گھر کی ذمہ داریوں کو نبھاتے ہوئے اپنی خوشی اور خواہشات کو دفنا دیتی ہے لیکن اس ظالم سماج کے استحصال ،ہم عمر شادی شدہ عورتوں کے طعنے اور ناروا سلوک کی وجہ

سے جس ذہنی و قلبی کرب سے گزرتی ہے۔ اس کے اسی کرب و بے بسی کی عکاسی بہترین انداز میں کی گئی ہے۔ مثلاً رتنا کے کرب کی تصویر کشی کرتے ہوئے وہ لکھتی ہیں:

''اب کسی شادی میں شریک ہونے کا اس کا جی نہیں چاہتا تھا۔ کم سن لڑکیاں اس کی ساتھی نہیں تھیں (وہ رتنا کہیں کھو گئی تھی جو ان کا ساتھ دے سکتی تھی، چنچل، خوش وخرم، بات بات پر قہقہہ لگانے والی، دانتوں تلے انگلی دبا کر فلمی ہیروؤں کا ذکر کرنے والی، کسی بھی عام لڑکی جیسی رتنا) اور شادی شدہ عورتوں میں وہ مدفاضل بن جاتی تھی مگر مینا کشی اس کو بہت عزیز تھی اس لیے وہ جی کڑا کر کے اس کی شادی میں آ گئی تھی۔ اور اب کرب کے اس لمحے سے گذر رہی تھی جو ہر محفل ہر ہنگامے میں اس کا مقدر بن جاتے تھے۔''

رتنا اگرچہ کہ تعلیم یافتہ ہے کالج میں پولیٹیکل سائنس کی لکچرر ہے لیکن وقت گزر جانے کے بعد اس کے رشتے آنے بند ہو جاتے ہیں اور شادی شدہ مانک چند جو دو بچوں کا باپ ہے رتنا سے چھپ کر شادی کرنا چاہتا ہے اور اپنے مفاد اور ہوس کی خاطر سماج سے اس شادی کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے تا کہ سماج میں اس کی بدنامی نہ ہو۔ وہ رتنا کو طرح طرح کے لالچ دے کر ورغلاتا ہے اکساتا ہے اور دھمکیاں بھی دیتا ہے۔ رتنا اس کی مفاد پرستی اور خودغرضی کی وجہ سے اس سے نفرت کرتی ہے لیکن آخر کار سماجی و معاشرتی رویوں سے بے زار ہو کر اس سے شادی کرنے کا ارادہ کر لیتی ہے۔ افسانہ نگار نے اس افسانے میں عورت کی اسی بے بسی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔

تانیثیت ترنم ریاض کے افسانوں کا خاص موضوع ہے۔ وہ بچپن ہی سے نہایت ہی ذہین و باشعور واقع ہوئی ہیں۔ اپنے جذبات واحساسات اور تجربات و مشاہدات کو کہانی کا رنگ دے کر پیش کرتی ہیں۔ ان کے نسوانی کردار ہمیں ہمارے ہی سماج کے جیتے جاگتے چلتے پھرتے کردار محسوس ہوتے ہیں کیوں کہ وہ جس شدت تاثر کے ساتھ اپنے افسانوں میں ہمارے عہد کے بعض اہم اور تلخ حقائق کی ایسی تصویر کشی کرتی ہیں کہ قاری خود کو ان حقیقتوں کا چشم دید گاہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ ان کے مشاہدہ کی گہرائی، عصری حسیت، سماجی حقیقت نگاری اور تانیثی فکر انھیں اپنے عہد کی خواتین قلم کاروں سے ممیّز کرتی ہیں۔

ترنم ریاض کے افسانوں کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بڑی شدت سے عورتوں کے درد و غم اور گھٹن کو محسوس کرتی ہیں اور پھر سماج کو ان تلخ حقیقتوں کا آئینہ دکھاتی ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک عورت کے استحصال اور ظلم و جبر کے ذمہ دار صرف مرد نہیں ہوتے ہیں بلکہ وہ پورا معاشرہ بھی برابر کا ذمہ دار ہے جسے وہ اپنا محافظ سمجھتی ہے لیکن اسے کہیں سے تحفظ نہیں ملتا۔ اس لیے یہ مسائل ہمارے سماج اور معاشرے یا کائنات کے مشترکہ مسائل بن جاتے ہیں۔

اپنے افسانوں کے ذریعے ترنم ریاض اپنے معاشرے کی فضا کو بہتر بنانا چاہتی ہیں جہاں مرد اور عورت خوشحال زندگی بسر کر سکیں۔ عورتیں اپنی نیکی، محبت، وفا شعاری، ایثار و قربانی جیسی صفات کی وجہ سے کبھی کبھی خود اپنے آپ پر ظلم کرنے لگتی ہیں۔ ترنم ریاض عورتوں میں احساسِ خودی اور خودشناسی کے جذبے کو پروان چڑھا کر یہ بتانا چاہتی ہیں کہ زیادہ محبت اور توجہ کی وجہ سے بھی اکثر مرد اپنے فرائض سے غافل ہو جاتے ہیں اور احساس برتری کا شکار ہو کر عورت پر ظلم و ستم کرنے لگتے ہیں مثلاً افسانہ ''ماں'' کا مرکزی کردار بھی ایک ایسی ہی عورت کا کردار ہے جو شوہر کی زیادتیوں کو برداشت کرتی رہتی ہے اور خود پر ہو رہے مظالم کا اظہار تک نہیں کر پاتی۔ آخر کار ایک دن اپنے درد کا اظہار دبے لہجے میں مگر احتجاجی انداز میں کرتے ہوئے پوچھ بیٹھتی ہے:

''پتہ نہیں میرا کیا قصور ہے۔ کوئی رشتہ دار ہوتا آس پاس کہیں۔ تو ہمیں بتاتا کہ خرابی کہاں ہے۔ میں خود کو ٹھیک رکھنے کی پوری کوشش کرتی ہوں۔ مگر مجھے خود پتہ ہی نہیں چلتا۔ میں اپنی طرف سے سب کام اچھے ڈھنگ سے کرتی ہوں..... مگر.....''

(''اماں'' ابابلیں لوٹ آئیں گی، ص134)

تبسم فاطمہ نے افسانوی دنیا میں قدم 1980 میں رکھا۔ ان کا

پہلا افسانوی مجموعہ 'لیکن جزیرہ نہیں' تخلیق کار پبلشرز سے 1995 میں منظر عام پر آیا ہے۔اکیسویں صدی میں ان کا افسانوی مجموعہ 'تاروں کی آخری منزل' 2012 میں شائع ہوا ہے۔ان میں کل سترہ افسانے شامل ہیں۔ان تمام افسانوں میں ان کی تانیثی فکر واضح طور پر سامنے آتی ہے۔تبسم فاطمہ ہمارے معاشرے میں عورتوں کے ظلم وستم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرتی دکھائی دیتی ہیں وہ ایسے کردار تخلیق کرتی ہیں جو ان معاشرتی مظالم و جبر کی روک تھام کے لیے باغیانہ جذبہ رکھتے ہیں۔

افسانہ 'حجاب' ایک باغی لڑکی کی کہانی ہے۔جو ایسے ماحول میں پیدا ہوتی ہے جہاں اسے کھل کر سانس لینے کی اجازت نہیں ہوتی۔ بچپن ہی سے مذہب اور اخلاق کے نام پر کہیں آنے جانے اور کسی سے ملنے پر روک لگائی جاتی ہے۔بالغ ہوتے ہی اس کے پڑھنے سے منع کر دیا جاتا ہے۔

اس افسانے میں نجمہ باجی کا کردار بھی اہم ہے جو والدین کے ہر فیصلے کو اپنی قسمت مان کر اپنی محبت کو قربان کر دیتی ہے اور والدین کی مرضی سے چپ چاپ شادی کر لیتی ہے لیکن باوجود ان سماجی و معاشرتی پابندیوں کے اس کی شادی ٹک نہیں پاتی۔اس کا شوہر خود اس سے طلاق لے لیتا ہے اور نجمہ بھی اپنی پسند سے زندگی جینے کا فیصلہ کر کے گھر سے چلی جاتی ہے۔جس سماج میں مرد کو اپنی آزادی سے جینے کا حق ہے وہاں مانگنے پر بھی عورتوں کو مساویانہ حقوق نہیں دیئے جاتے ہیں۔جس کی وجہ سے عورتیں اپنے حقوق کی خاطر بغاوت کرنے پر مجبور ہوتی ہیں۔

غزال ضیغم اکیسویں صدی کی افسانہ نگار خواتین میں نمایاں نام ہے۔ان کا افسانوی مجموعہ 'ایک ٹکڑا دھوپ کا' 2000 میں منظر عام پر آیا۔ان کے افسانے 'سورونشی چندر ونشی'، مدھوبن میں رادھیکا' اور ایک ٹکڑا دھوپ' اہمیت کے حامل ہیں۔انھوں نے اپنے افسانوں میں تانیثی فکر کو بڑے عمدہ طریقے سے پیش کیا ہے۔افسانہ ''مدھوبن میں رادھیکا''میں نجمہ باجی کا کردار جدید فکر وذہن کی خاتون کا کردار ہے جو ہمارے معاشرے کے اس دوہرے رویئے پر سوال اٹھاتی ہیں کہ سگریٹ نوشی سے مرد ہو یا عورت دونوں کے پھیپھڑے خراب ہوتے ہیں نہ کہ سگریٹ پینے سے عورت کا کردار خراب ہو اور مرد کے صرف پھیپھڑے۔اسی طرح افسانہ 'زندہ اور مردہ آنکھیں' میں غزال ضیغم نے عورت کی ہمت و جرأت کو موضوع بنایا ہے۔ افسانہ ''بے دروازے کا گھر''میں ایک خودار اور ذمہ دار عورت کی کہانی بیان کی گئی ہے جو Self Dependent ہوتی ہے اور آزادانہ طور پر زندگی بسر کرتی ہے۔افسانہ ''سورونشی چندر ونشی'' میں بھی تانیثی فکر پورے طور پر نظر آتی ہے جب روحی شادی جیسے اہم فیصلہ کو خود کرنا چاہتی ہے وہ اعلی تعلیم حاصل کر کے اپنا کیریئر بنانا چاہتی ہے لیکن اس کے گھر والے زبردستی اس کی شادی اس کی بڑی چچا کے بیٹے عادل سے کرنا چاہتے ہیں۔لیکن وہ اپنے خاندانی اور زمیندارانہ ذہنیت کے خلاف احتجاجی رویہ اختیار کرتے ہوئے کہتی ہے:

کہنی مار مار کر مجھے خاموش نہیں کرا سکتیں آپ، بڑی اماں۔
میں شہر میں کسی کم بخت کا منہ نہیں دیکھتی۔لیکن ابھی چیخ چیخ کر کہہ دوں گی کہ مجھے عادل جیسے دبو رئیس سے شادی نہیں کرنی۔۔۔نہیں کرنی۔۔
کیوں۔۔۔کیوں نہیں کرنی۔۔۔تم میں سرُ خاب کے پر لگے ہیں۔اماں جانی کھول اٹھیں۔
ہاں مجھ میں سرُ خاب کے پر لگے ہیں۔میں ہرگز شادی نہیں کروں گی۔۔۔میں آپ کی زمین کا قطعہ نہیں ہوں کہ جس کو چاہے آپ دے دیجیے۔اکیس سال کی بالغ لڑکی ہوں۔ قانونی حق ہے میرے پاس، بالغ ہونے کا۔''

(افسانہ 'ایک ٹکڑا دھوپ کا''نرالی دنیا پبلیکیشنز، 2000، ص22)

غرض غزال ضیغم نے اپنے افسانوں میں ان خواتین کو ہمارے معاشرے میں ہو رہے مظالم اور استحصال و جبر کے خلاف احتجاج کرتے دکھا کر ان خواتین کے شعور کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے جو ظلم کو خاموشی سے سہنا ہی اپنا مقدر سمجھنے لگتی ہیں۔

ثروت خان عصر حاضر کی خواتین افسانہ نگاروں میں اہمیت رکھتی ہیں ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'ذروں کی حرارت' 2000 میں

شائع ہوا ہے ۔ثروت خان نے اپنے افسانوں میں جہاں راجستھانی تہذیب اور کلچر کو خوبصورتی سے پیش کیا ہے وہیں تانیثی مسائل کی عکاسی بھی بڑی عمدگی سے کی ہے ۔ان کا افسانہ ''مرد مار بھلی'' میں خواتین کی ازدواجی زندگی میں ہورہے استحصال کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اس افسانے کا مرکزی کردار سنبل ہے جو بچپن میں اپنی ماں کو مارتے ہوئے دیکھتی تھی جس کی وجہ سے اس میں ایسے مردوں کے خلاف باغیانہ جذبات پروان چڑھتے ہیں جو عورت کو اپنی جائیداد سمجھ کر ظلم وستم کرتے ہیں۔

ثروت خان نے افسانہ ''ترشنا'' میں سماج کی لڑکیوں کے تئیں دوہرے رویے کہ لڑکی لمبی وخوبصورت نہیں ہے تو اسے پسند نہیں کیا جائے گا جیسے منفی رویئے کو حدف کا نشانہ بنایا ہے۔اسی طرح افسانہ ''مردانگی'' میں ہمارے معاشرے اور سماج میں صدیوں سے عورتوں پر ہورہے تشدد اور ظلم و جبر کے خلاف 'مانگی' کے کردار کے ذریعے احتجاج کو درج کرکے اس کے روک تھام کی کوشش کی ہے۔

تانیثی فکر رکھنے والی خواتین افسانہ نگاروں میں صادقہ نواب سحر عصر حاضر میں اہمیت رکھتی ہیں ۔ان کا افسانوی مجموعہ ''خلش بے نام سی'' کے تین ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں جو ان کے افسانوں کی مقبولیت کی دلیل ہیں۔صادقہ نواب سحر کے افسانوں کا خاص محور ان کی تانیثی فکر ہے ۔ان کے افسانوں میں معاشرے کے سیاسی، سماجی اور معاشی مسائل کے پس منظر میں خواتین کے بے شمار مسائل ملتے ہیں خصوصاً مرد کی بے وفائی، عورت کی بے بسی و مجبوری، تنہائی کا کرب، عورتوں کا استحصال اور ان کے حقوق کی حق تلفی جیسے مسائل اہمیت رکھتے ہیں ۔ان کے افسانوں کے نسوانی کردار اپنے مسائل میں پریشان ہونے کے باوجود خوددار، باہمت و حوصلہ مند نظر آتے ہیں ۔ ایسا ہی ایک کردار شریا والی اور اس کی سوتیلی بیٹی رقیہ کا ہے جو با عزم وحوصلہ مند خواتین ہیں ۔افسانہ 'شیریا والی' کا موضوع کم عمر کی شادی اور بے جوڑ شادی ہے ۔اس افسانے کا مرکزی کردار نصیبن کی شادی بھی کم عمری ہی میں کردی جاتی ہے جو جلد ہی بیوہ ہوجاتی ہے لیکن چوں کہ آج بھی دیہاتوں میں بیوہ کی شادی کو معیوب سمجھا جاتا ہے۔اس لیے اس کی دوسری شادی کو یہ ظالم سماج قبول نہیں کر پاتا ہے لیکن یہاں نصیبن اپنی قسمت کو کوستے رہنے کی بجائے سماج سے بغاوت کرکے اپنی مرضی سے شادی کرلیتی ہے اس کی بیٹی رقیہ کی بے جوڑ شادی کی وجہ سے کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے لیکن وہ اپنے معاشرے سے باغی ہوکر احتجاجاً کسی پرائے مرد کے ساتھ رہنے لگتی ہے۔ جو اسے بہت خوش رکھتا ہے۔ یہ آج کے عہد کی تانیثی فکر ہے جہاں عورتیں اپنے اچھے برے کی خود تمیز کرتی دکھائی دیتی ہیں اور ناانصافی اور استحصال کے خلاف اٹھ کھڑی ہوکر اپنے فیصلے خود ہی کرتی نظر آتی ہیں۔

شائستہ فاخری اردو افسانہ نگاری میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہیں ۔ان کے افسانوی مجموعے 'اداس لمحوں کی خود کلامی' (2014)، 'وصف پیغمبری مانگ'' (2016) اور 'خشک پتوں کی موسیقی' کے عنوان سے منظر عام پر آچکے ہیں۔ان کی کہانیاں عام طور پر خواتین کے مسائل کے ارد گرد گھومتی ہیں۔ان کا ہر نسوانی کردار اپنی بقا کے لیے احتجاج کرکے آگے بڑھتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ان کے افسانوں پر اظہار خیال کرتے ہوئے پروفیسر مغنی تبسم لکھتے ہیں:

> ''شائستہ فاخری نے بیشتر افسانوں میں ہندوستانی سماج میں عورتوں کے مسائل اور پدرسری معاشرے میں ان کی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کو موضوع بنایا ہے۔۔۔ شائستہ فاخری کے فن کی خوبی یہ ہے کہ وہ کردار و وقعات کا اپنے آس پاس کے ماحول سے انتخاب کرتی ہیں اور خاصی فنکارانہ نزاکت اور چابک دستی کے ساتھ اپنے کرداروں میں نفسیاتی، جنسی اور سماجی مسائل کا تجزیہ کرتی ہیں۔وہ شکست ومحرومی کو ہی اہمیت نہیں دیتی ہیں بلکہ ایسے حالات بھی پیش کرتی ہیں جو مسرت اور نشاط انگیز ہیں۔''

تانیثیت عورت کو سماج کے ذہنی و جسمانی دباؤ سے آزاد کرکے اسے محض انسان تسلیم کرانے کے حق میں ہے جس طرح مردوں پر تہذیبی، مذہبی اخلاقی اور معاشرتی دباؤ کم ہوتا ہے اسی طرح تانیثیت ذہنی آزادی کے ساتھ ساتھ جسمانی آزادی کی بھی متمنی ہے ۔شائستہ فاخری نے اپنے افسانوں میں خواتین کے بے شمار مسائل کو پیش کرتے ہوئے ان کے

ساتھ ہو رہے ذہنی و جسمانی جبر وتشدد کے خلاف آواز بلند کرتی ہیں ان کے نسوانی کردار اپنے حق تلفی کے خلاف ہمیشہ احتجاج کرتے نظر آتے ہیں۔افسانہ 'گلی کا دوسرا کنارہ' میں عورت کو انسان کے بجائے محض چیز سمجھنے والے مرد معاشرے کی تصویر پیش کی ہے۔

شائستہ فاخری کے تمام افسانوں کے نسوانی کردار اپنے حق کے لیے آواز اٹھانا جانتے ہیں اور سماج کی ناانصافیوں ،غیر مساویانہ سلوک ،ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کر کے اپنی بقا کا خود انتظام کرتے نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر اشرف جہاں بھی موجودہ دور میں تانیثی فکر رکھنے والی اہم افسانہ نگار ہیں۔ان کے افسانوی مجموعہ 'اکیسویں صدی کی نرملا' اور 'اگر میں نہ ہوتی' منظر عام پر آ کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ان کی کہانیوں کا محور بھی عورت اور اس کے بے شمار مسائل ہیں۔ڈاکٹر اشرف جہاں کے کردار پڑھے لکھے اور تعلیم یافتہ ہیں۔ وہ معاشی اور اقتصادی طور پر خود کفیل ہونا پسند کرتے ہیں اور سماج میں مردوں کے شانہ بہ شانہ چل کر زندگی بسر کرنا اپنا پیدائشی حق تسلیم کرتے ہیں۔افسانہ بدر کامل، شکنتلا اور اکیسویں صدی کی نرملا کے نسوانی کردار اگر چہ کہ اپنی تنہائی، بے بسی اور اپنوں کی بے اعتنائی کا شکار ہیں لیکن اپنی شناخت خود قائم کر آزادی کے لیے احتجاج کا رویہ بھی اختیار کرتے ہیں۔مثلاً جب افسانہ ''اکیسویں صدی کی نرملا'' میں اس کے کالج کا بوائے فرینڈ اسے محبت سے پریم چند کی نرملا کہتا ہے تو غصے سے بھڑک اٹھتی ہے اور مردوں کے اس رویئے پر جو عورت کو محض خاموشی سے تمام مسائل برداشت کرنے والی محکوم لڑکی سمجھتے ہیں احتجاجاً کہتی ہے:

''وہ غصے سے آگ بگولہ ہو رہی تھی۔اس پر برس پڑی خبردار جو مجھے نرملا کہا۔نفرت ہے مجھے ان جاہل گنوار عورتوں سے جو سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کی چتا پر جل جاتی ہیں۔ نفرت ہے مجھے نرملا کے کردار سے۔۔۔''

(ڈاکٹر اشرف جہاں،اکیسویں صدی کی نرملا،ایجوکیشن بک ہاؤس،علی گڑھ،2009،ص)

اشرف جہاں کے نسوانی کردار یقیناً اکیسویں صدی کے کردار ہیں ان میں زندگی کی حرارت ہے وہ ظلم وستم برداشت نہیں کرتے لیکن محبت میں جان دینے کے لیے راضی ہو جاتے ہیں۔ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کرتے ہیں چاہے وہ ستم عورت کا عورت پر ہی کیوں نہ ہو۔کیوں کہ تانیثیت صرف پدری نظام کے خلاف نہیں ہے بلکہ عورت کی اپنی آزادی اور شناخت کی بازیابی کا نام ہے جو عورتوں کی زیاتیوں کے خلاف بھی احتجاج کر کے اپنی حیثیت کو منوانے کا نام ہے۔غرض اکسویں صدی میں خواتین افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں جہاں ہمارے معاشرے وسماج کے بعض اہم مسائل کو موضوع بنایا ہے وہیں عورتوں کے ساتھ برسوں سے ہو رہی ناانصافی، عدم توجہی ،لاپرواہی، تشدد، ظلم و جبر اور عدم برابری و منفی سلوک کے خلاف احتجاج درج کر کے عصر حاضر کی خواتین میں بلند ہمت و حوصلہ مند بننے کا شعور بیدار کرنا اور خود کفیل ہو کر اپنے حق کے آواز اٹھانے کا جذبہ پیدا کیا ہے۔ان خواتین افسانہ نگاروں نے اپنی تانیثی فکر کے ذریعے ہمارے سماج و معاشرے کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا ہے۔ہمارے سماج و معاشرے پر برسوں سے مردوں کے دوہرے رویئے،عورتوں کی جہالت وتوہمات، بہوؤں پر ساس کے مظالم کی وجہ سے جو منفی اثرات مرتب ہو رہے ہیں ان کی روک تھام کی سعی بھی کی ہے اور آج کی تعلیم یافتہ اور باشعور عورتوں کو سماج میں برابری کا حق حاصل کرنے اور اپنی منفرد پہچان کے ساتھ جینے کا دینے والی اکیسویں صدی کی دیگر اہم خواتین افسانہ نگاروں میں نگار عظیم، کہکشاں پروین، ذکیہ ظفر، بانو سرتاج، حاجرہ شکور، قمر جمالی، عائشہ صدیقہ، عذرا نقوی اور افشاں ملک وغیرہ کے نام اہمیت ہیں۔ جنھوں نیا پنی تانیثی فکر کے ذریعے افسانہ نگاری کی روایت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہی ہیں۔

❐❖❐

Dr. Arshia Jabeen
Professor
Dept. of Urdu
School of Humanities
University of Hyderabad
Hyderabad-500046 (T.S)

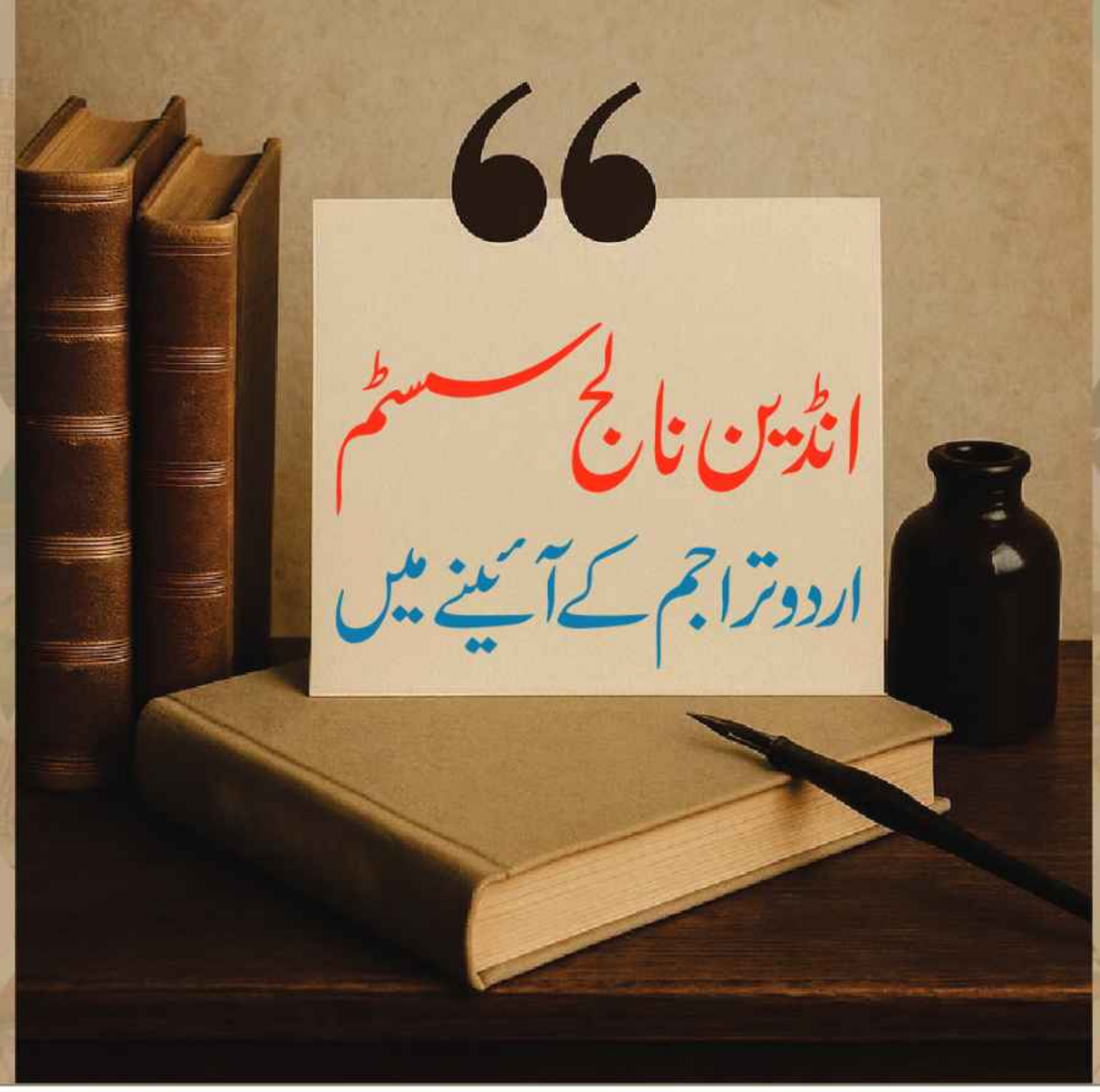

انڈین نالج سسٹم
اردو تراجم کے آئینے میں

شہلا کلیم

قومی وراثت وثقافت کسی بھی قوم کی شناخت، تاریخ اور روح کا نام ہے۔قومی وراثت سے مراد وہ مادی اور غیر مادی سرمایہ ہے جو ایک قوم کو اس کے اسلاف سے منتقل ہوا ہو، جیسے تاریخی عمارات، فنونِ لطیفہ، زبانیں، روایات اور رسم ورواج وغیرہ۔

ثقافت کسی قوم کے طرزِ زندگی، عقائد وافکار، تہذیبی اقدار، زبان و ادب، فنون اور سماجی رویّوں کا مجموعہ ہوتی ہے۔ ہندوستانی قومی وراثت وثقافت ان دونوں عناصر کے باہمی امتزاج کا نام ہے۔

ہندوستان کا شمار دنیا کی قدیم ترین تہذیبوں کے حامل ممالک میں ہوتا ہے، جہاں علم ودانش کی روایت ہزاروں برس پر محیط ہے۔ یہاں علم کو محض معلومات کا ذخیرہ نہیں بلکہ زندگی گزارنے کا مکمل ضابطہ سمجھا گیا۔ اسی علمی ورثے کو جدید اصطلاح میں انڈین نالج سسٹم کہا جاتا ہے، جو ہندوستانی تہذیب، فلسفہ، سائنس، فنون وادب، طب، ریاضیات، فلکیات، سماجیات اور روحانیت پر مشتمل ایک جامع علمی ڈھانچہ ہے۔

انڈین نالج سسٹم سے مراد وہ مجموعۂ علوم و افکار ہے جو قدیم ہندوستان میں ویدک دور سے لے کر قرونِ وسطیٰ تک مختلف علمی، فکری اور تہذیبی روایتوں کے ذریعے تشکیل پایا یہ زبانی روایات، تحریری متون، عملی تجربات اور روحانی مشاہدات پر مبنی ہے۔

یوں تو اردو زبان اپنے آغاز وارتقا کے اعتبار سے بذات خود ہندوستانی وراثت وثقافت کا ایک اہم حصہ ہے؛ لیکن اس مقالے میں یہ جائزہ پیش کیا جائے گا کہ اردو تراجم نے اس ہندوستانی قومی وراثت کے کن پہلوؤں کو محفوظ کیا اور اسے آگے بڑھایا۔

ہندوستانی وراثت وثقافت کا اولین عہد ویدک دور کہلاتا ہے۔ تقریباً 1500 ق م سے 600 ق م کو ویدک ادب کی ترقی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ یہ چہار ویدوں؛ رِگ وید، سام وید، یَجُر وید اور اتھر وید کا زمانہ ہے۔ رگ وید میں آریاؤں کے مذہبی اور فلسفی احساسات کا شعری طرز میں اظہار کیا گیا ہے۔ رگ وید عقیدے اور حمد وثنا کا وید کہلاتا ہے۔ یَجُر وید دوسرا اہم وید ہے۔ اس کا بنیادی موضوع یگیہ (قربانی) اور مذہبی رسومات کے دوران پڑھے جانے والے عملی منتر ہیں۔ یَجُر وید کو عمل اور عبادت کا وید کہا جاتا ہے۔ تیسرا وید سام وید کہلاتا ہے۔ اس کی بنیادی شناخت موسیقیت، نغمگی اور گائیکی ہے۔ سام وید کو راگ اور سُر کا وید کہا جاتا ہے۔ دراصل سام وید کے منتروں کا استعمال خوش الحانی کے ساتھ گا کر دیوتاؤں کے استقبال کے لیے کیا جاتا ہے۔ اتھر وید ہندومت کے چار مقدس ویدوں میں چوتھا اور آخری وید ہے۔ یہ وید دیگر ویدوں کے مقابلے میں عام انسانی زندگی کے زیادہ قریب ہے، کیونکہ اس میں روزمرہ کے

مسائل، سماجی تقاضوں، بیماریوں، خوف، امنگوں اور نفسیاتی کیفیات کا بیان ملتا ہے۔ اسی بنا پر اسے عوامی زندگی کا وید بھی کہا جاتا ہے۔

دنیا کی کئی زبانوں میں ان ویدوں کے تراجم ہوئے۔ یہاں نمونے کے طور پر چاروں ویدوں کے چند تراجم پیش کیے جا رہے ہیں۔

ماسٹر لچھمن داس، رگ وید سنہتا حصہ اول، 1873، دلی

رام جگناتھ، رگ وید آدی بھاشیہ بھومکا، 1898

رگ وید کا ایک مشہور و معروف منتر جسے گایتری منتر کہا جاتا ہے اور عقیدت مند اسے مقدس مان کر ورد کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے اس منتر کا منظوم ترجمہ 'آفتاب' کے عنوان سے کیا ہے۔ یہ نظم بانگِ درا میں شامل ہے۔

آشورام آریہ، یجر وید حصہ اول، 1984، ہند سماچار پریس

مولوی عبد الحق ودیارتھی، یجر وید کا اردو ترجمہ، 1927، احمدیہ انجمن اشاعت اسلام، لاہور

آنند سوروپ، سامہ وید، 1897، ودیا ساگر پریس

آشورام آریہ، سام وید حصہ اول، 1988، آریہ آفسیٹ پریس دہلی

اسکرپٹ رائیٹر اور فلم ساز اقبال درانی کے ذریعے کیا گیا سام وید کا اردو ترجمہ 2023 میں منظر عام پر آیا۔

اتھر وید کے باقاعدہ اردو تراجم تک رسائی تو نہ ہو سکی البتہ کنہیا لال الکھ وہاری نے چاروں ویدوں کا خلاصہ 'خلاصہ چار وید' کے نام سے اردو میں کیا۔ اس میں اتھر وید بھی شامل ہے۔

اس کے علاوہ خلیل احمد نے یجر وید اور دوسرے ویدوں کے منتروں کا اردو میں ترجمہ کیا۔

اپنیشد ویدک ادب کا آخری اور بلند ترین فکری حصہ ہیں، جن میں فلسفہ، معرفت اور روحانیت کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس دور کے مفکرین اور رشیوں نے اپنیشدوں میں مذہب کو محض رسوم و قربانیوں سے نکال کر باطنی معرفت اور روحانی ادراک کی طرف منتقل کیا۔ اس طرح اپنیشدوں کی فلسفیانہ روایت وجود میں آئی۔ یہ ترتیب اس بات کی علامت ہے کہ مذہبی فکر بتدریج رسومات سے فلسفہ کی طرف منتقل ہوئی۔ اپنیشد کے معنی ہیں؛ شاگرد کا استاد کے قریب ادب و انکسار سے بیٹھ کر باطنی علم حاصل کرنا۔ اسی لیے اپنیشدوں کو اسرارِ حیات اور معرفتِ حقیقت کا خزانہ کہا جاتا ہے۔

اپنیشدوں کی تعداد 108 بتائی گئی ہے جن میں 13 بہت اہم ہیں۔

اپنشیدوں کے بھی دیگر زبانوں کے ساتھ اردو میں بھی تراجم ہوئے۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں کے فرزند دارا شکوہ نے 1657 میں کاشی کے پنڈتوں کی مدد سے 50 اپنیشدوں کا فارسی ترجمہ 'سرِ اکبرٗ' کے نام سے کیا۔ اسی فارسی ترجمے کی بنیاد پر 1861 میں کنہیا لال نے اپنشدوں کا ترجمہ الکھ پرکاش کے نام سے کیا جو گیان پریس آگرہ سے شائع ہوا۔ حسن عسکری نے مختلف بارہ اپنیشدوں کا اردو ترجمہ و تجزیہ کیا جو 2007 میں مرزا فرحت اللہ بیگ اکیڈمی حیدر آباد سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اپنیشدوں کے بہت سے اردو تراجم دستیاب ہیں۔

دھرم سوتروں یعنی سماجی و اخلاقی قانون کے پیرائے میں مہارشی منو کی تصنیف منو اسمرتی اور سیاسیات و معاشیات کے باب میں کوٹلیہ چانکیہ کی تصنیف ارتھ شاستر انتہائی اہمیت کی حامل ہیں۔

بھگوان دیال عاقل نے منوسمرتی کا ترجمہ کیا۔ منوسمرتی کا ایک اردو ترجمہ 1883 میں شائع ہوا۔ دھرم ساگر کے نام سے سیالکوٹ سے بھی ایک ترجمہ منواسمرتی کا شائع ہوا۔

چانکیہ کی ارتھ شاستر کا اردو ترجمہ شان الحق حقی نے کیا جو 1999 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دلی سے شائع ہوا۔

ہندوستانی قومی وراثت و ثقافت کے بیان کی تکمیل پورانوں کے ذکر کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ویدک عہد کے بعد پرانوں کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ پوران کے معنی روایات پر مبنی، قدیم یا پرانا ہے۔ علمی تنوع کے اعتبار سے پورانوں کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس میں قصے کہانی، دیوی دیوتاؤں کا ذکر، علم الانساب، تاریخ، جغرافیہ، قواعد، شعریات، نجوم، آیوروید اور دیگر علوم و فنون غرض سبھی قدیم عوامل شامل ہیں۔ پورانوں کی تعداد 18 ہے۔

پورانوں کے بہت سے اردو تراجم دستیاب ہیں جن میں سے یہاں صرف نول کشور پریس لکھنؤ سے شائع ہونے والے چند اہم

تراجم پیش کیے جارہے ہیں۔

جگناتھ نشتر، بھاگوت پوران کا ترجمہ 'بھاگوت نظم اردو' کے نام سے، 1881، نول کشور پریس، لکھنؤ

بابا ہر پرساد، آتمہ پوران کا ترجمہ 'خلاصہ آتمہ پوران' کے نام سے، 1884

دیال شنکر فرحت، بھاگوت پوران کا پریم ساگر کے نام سے منظوم ترجمہ، 1879

للولال جی، بھاگوت پوران کے دسویں حصے کا پریم ساگر کے نام سے، 1895

رامائن اور مہابھارت سنسکرت زبان کی لازوال تصانیف ہیں۔ ان تصانیف پر ہندوستان کی ادبی وراثت کا دارومدار ہے۔ یہ تصانیف ویدک اور کلاسیکی ادب کے درمیانی دور کی تخلیق ہیں۔ یہ تصانیف نہ صرف سنسکرت ادب بلکہ پوری ہندوستانی تہذیب وسماج پر اثر انداز ہوئیں۔ والمیکی کی رامائن کے دیگر زبانوں میں نہ صرف تراجم کیے گئے بلکہ اسے بنیاد بنا کر بہت سی تصانیف وجود میں آئیں۔ اور رامائن کے مختلف حصوں کو بنیاد بنا کر ڈرامے اور نظمیں لکھی گئیں۔ مثلاً برج نرائن چکبست کی نظم 'رامائن کا ایک سین'۔

'پیارے رام' کے عنوان سے طلبا کے لیے کتابچے کی صورت منشی بنارس داس کی تصنیف۔

رامائن کی بنیاد پر منشی عبدالقیوم نے 'بالک رامائن' کی تصنیف کی۔

سردار جسونت سنگھ ٹوہانوی نے رامائن کو ایک ناٹک کے طور پر لکھا۔

مہابھارت قدیم ہندوستانی تہذیب، ادب اور ثقافت کا مجموعہ ہے۔ اس کے تراجم اور تصانیف بھی رامائن کی طرز پہ ہوئے۔

سکھ دیال سنگھ نے ڈرامے کی شکل میں مہابھارت کے کچھ حصوں کا ترجمہ کیا جو 1893 میں مفید عام پریس آگرہ سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ بھی اردو کے دیگر تراجم دستیاب ہیں۔

گیتا مہابھارت کے بھیشم پرو کا حصہ ہے۔ دراصل یہ جنگ کے آغاز سے قبل کرشن اور ارجن کے درمیان ہونے والا مکالمہ ہے۔ گیتا کی تعلیم کے دو حصے ہیں۔ فلسفہ اور مذہب۔

گیتا کا ابتدائی ترجمہ دکنی اردو میں ہوا۔ یہ ترجمہ سترہویں صدی کے دکنی شاعر سید مبین نے 'کرشن گیتا ارجن گیتا' کے نام سے کیا۔ اس کے علاوہ گیتا کے دیگر بہت سے منظوم ومنثور اردو تراجم دستیاب ہیں۔

ہندوستان کے کلاسیکی ادب کی بات کی جائے تو اس کی جڑیں بھی سنسکرت زبان میں پیوست نظر آتی ہیں۔ سنسکرت کلاسیکی ادب دنیا کا قدیم اور شہرت یافتہ ادب ہے۔ اس میں بہت سی اہم ادبی اصناف مثلاً مثنوی، داستان، نظم، قصہ گوئی اور ڈرامہ نگاری کی ترقی ہوئی۔

ہندوستان میں کالی داس کو سنسکرت ادب کا عظیم شاعر اور ڈرامہ نگار تسلیم کیا جاتا ہے۔ کالی داس کی تصانیف میں تین ڈرامے (ابھیگیانہ، شاکنتلم، مالویکاگنی مترا) اور چار طویل نظمیں (کمار سمبھو، رگھوونش، رتوسنہار، میگھ دوت) شامل ہیں۔

ان تصانیف کے بھی بہت سے اردو تراجم ہوئے جن میں سے چند درج کیے جارہے ہیں۔

منور لکھنوی، مالویکاگنی مترا کا ترجمہ، 1973، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ

عرفان صدیقی، مالویکاگنی مترا، اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ

اظہر سعید خان، میگھ دوت کا منظوم ترجمہ، 2002، مدھیہ پردیش اردو اکادمی بھوپال

کالی داس کے شہرۂ آفاق ڈرامے شکنتلا کے دنیا کی مختلف زبانوں میں کثرت سے تراجم ہوئے۔ اردو زبان میں بھی اس کے بہت سے تراجم دستیاب ہیں۔ شکنتلا کا ابتدائی اردو ترجمہ جان گلکرسٹ کی فرمائش پر 1801 میں مرزا کاظم علی جوان نے کیا۔ اس کے بعد اردو میں بہت سے تراجم ہوئے۔ مثلاً: اختر حسین رائے پوری، 1939، انجمن ترقی اردو حیدرآباد

ساغر نظامی، 1960، ادبی مرکز، دلی

ہندوستانی کلاسیکی ادب حکایات پر مشتمل تصانیف سے بھی مالا مال ہے۔ مثلاً اخلاقی قصوں اور حکایات پر مبنی آچاریہ وشنو گپت کی تصنیف پنچ تنتر۔ زندگی کے اصولوں پر مشتمل اس حکایت نامے نے

دنیا کی مختلف زبان وادب پر گہرا نقش چھوڑا۔ سنسکرت سے عربی و فارسی زبانوں میں مختلف ناموں سے اس کے تراجم ہوئے جو بعد میں بہت سے اردو تراجم کی بنیاد بنے۔

رفیعہ شبنم عابدی نے 'انوار سہیلی کی کہانیاں' کے نام سے پنچ تنتر کی کہانیوں کو مدون کیا۔ جو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دلی سے شائع ہوا۔

سنسکرت کلاسیکی شاعری کے حوالے سے بھرتری ہری کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ ان کے شتکوں کے اردو ادیبوں نے بہت سے تراجم کیے۔ یہی وہ شاعر ہے جس کے ایک شلوک کا منظوم ترجمہ علامہ اقبال نے بالِ جبریل میں سرِ عنوان درج کیا۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

فلسفے ہندوستانی وراثت وثقافت کا انتہائی اہم جز ہے۔ ہندوستانی فلسفے کے چھ شعبے ہیں۔

گوتم کا نیائے فلسفہ ، کناد کا ویشیشک ، کپل کا سانکھیہ ، جیمنی کا میمانسا، ویاس کا ویدانت اور پتنجلی کا یوگ۔

ان ہندوستانی فلسفوں کے اردو تراجم کی کچھ مثالیں درج ذیل ہیں۔

کرشن کمار پاٹھک، پتنجلی کے یوگ درشن کا اردو ترجمہ 'پتنجلی کا فلسفہ یوگ' کے نام سے، 1989 ، ترقی اردو بیورو، نئی دلی

درشنانند، گوتم کے نیائے درشن کا اردو ترجمہ، 1917 ، لاہور

پیارے لال، ویشیشک درشن کا اردو ترجمہ، 1900

سنسکرت شعریات میں کشف و الہام کے موضوع پر آنند وردھن نے دھونیا لوک کی تالیف کی ۔ عنبر بہرائچی نے اس کا اردو ترجمہ کیا جو کہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دلی سے شائع ہوا۔

صفر، اعشاری نظام، الجبرا اور جیومیٹری میں ہندوستانی علما کی خدمات عالمی سطح پر تسلیم شدہ ہیں۔ آریہ بھٹ اور برہما گپت اس کے نمایاں نام ہیں۔ بھاسکراچاریہ کی علم الحساب کی کتاب لیلاوتی 12 ویں صدی کی تصنیف ہے، اس کا مغل دور میں فیضی نے فارسی ترجمہ کیا۔ دیوی چند نے اسی کا اردو ترجمہ 1895 میں کیا جو سیالکوٹ سے شائع ہوا۔

کسی بھی ثقافت کی بقا اور فروغ میں ترجمہ کا کردار کلیدی ہوتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ترجمہ دو تہذیبوں کے درمیان پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اردو زبان اپنی پیدائش ہی سے تہذیبی اشتراک کی علامت رہی ہے۔ اس زبان کی انفرادیت یہ ہے کہ اس نے مختلف تہذیبوں، زبانوں اور فکری روایتوں کو ایک لڑی میں پرویا۔ اس وحدت کے قیام اور تسلسل میں ترجمہ نگاری نے بنیادی کردار ادا کیا۔ اردو زبان کی تاریخ میں ترجمہ نگاری کو ابتدا سے ہی مرکزی حیثیت حاصل رہی ہے۔ یہ نہ صرف لسانی توسیع کا ذریعہ بنی بلکہ تہذیبی، قومی اور فکری وراثت کی حفاظت اور ترسیل میں بھی غیر معمولی کردار ادا کرتی رہی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ ہندوستانی وراثت وثقافت کے تقریباً تمام بنیادی عناصر مثلاً فلسفہ و روحانیت ، آیورویدا اور طب ، یوگ اور دھیان، فنون لطیفہ ، ریاضیات، فلکیات، ادب اور لسانیات وغیرہ علوم کے اردو تراجم نے نہ صرف محفوظ کیا بلکہ انہیں نئی زندگی دی، نئے قاری فراہم کیے اور ہندوستان کے علمی و تہذیبی ورثے کو دوام بخشا۔ اس اعتبار سے اردو زبان قدیم ہندوستانی علوم کی بقا اور حفاظت کی ضامن ہے۔

کتابیات:

1 شیخ عبدالغنی، سنسکرت ادب کے اردو تراجم، 2015، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دلی

2 قاضی حبیب احمد ، اردو میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت، 2015 ,شعبۂ اردو مظہر العلوم، آمبور

3 گوپی چند نارنگ، ہندوستانی قصوں سے ماخوذ اردو مثنویاں، 1962، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دلی

4 مرزا حامد بیگ، اردو میں ترجمہ نگاری کی روایت، 2016 ، دوست پبلی کیشن، اسلام آباد

5 مرزا کاظم علی جوان، شکنتلا، 1963، لاہور

❐❐❐

Shehla Kaleem
Room No: 12,Lohit Hostel,
Girl's Wing
JNU, New Delhi. 110067
Mobile No: 7017251700

عنبر فشاں

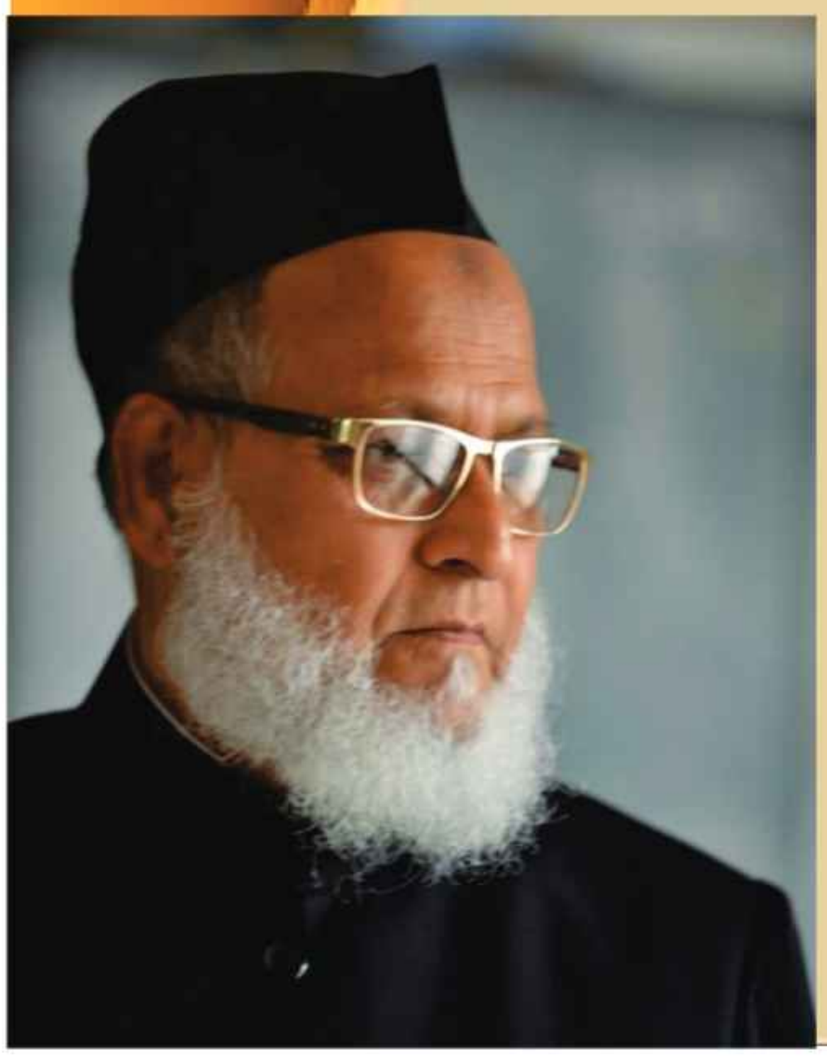

مشتاق احمد نوری کا افسانوی سفر

بہار میں اردو افسانہ نگاری کی جب بھی بات ہوگی تو اس میں ایک اہم نام مشتاق احمد نوری کا بھی ابھر کر سامنے آئے گا۔ ان کی پیدائش 7 مئی 1950 کو پورنیہ، بہار میں ہوئی۔ انھوں نے شاعری میں طبع آزمائی کی اور بچوں کے لیے کہانیاں و تنقیدی مضامین بھی لکھے ہیں۔ لیکن ان کی اصل شناخت اردو افسانہ ہے۔

1977 میں انھوں نے بہار پبلک سروس کمیشن کا امتحان پاس کیا اور پہلی پوسٹنگ چھپرا کے سارن ڈویژن میں ہوئی۔ اس کے بعد کشن گنج، پورنیہ، ارریہ، سہسرام، سمستی پور ہوتے ہوئے پٹنہ پہنچے، جہاں 2011 میں وہ جوائنٹ ڈائریکٹر آئی اینڈ پی آر ڈی سے ریٹائر ہوئے۔ وہ چیف پی آر او دو بار اور کیبینیٹ منسٹری میں سکریٹری بھی رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بہار اردو اکادمی کے برسوں سکریٹری رہے۔ 'زبان وادب' کی ادارت کی اور اسے معیار کی بلندیوں تک پہنچایا۔ افسوس کی بات ہے کہ ان کے استعفی دینے کے بعد سے اب تک کوئی بہار اردو اکادمی کا سکریٹری نہیں بن پایا ہے جو اردو والوں کے لیے افسوس ناک بات ہے۔

مشتاق احمد نوری کے اب تک تین افسانوی مجموعے 'تلاش' (1987) 'بند آنکھوں کا سفر' (1996) 'چھت پر ٹھہری دھوپ'، شائع ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ 'کائیں کائیں' کے نام سے بھی ایک کتاب شائع ہوئی ہے۔ ان کی بے حد مشہور کہانی میں ''کائیں کائیں'' کا ذکر آتا ہے۔ ابھی حال ہی میں این سی پی یو ایل، دہلی کے ڈائرکٹر شمس اقبال نے جب بچوں کے لیے سہ روزہ کہانی ورکشاپ کیا تو اس میں اس کہانی کو بھی بچوں کو پڑھنے کے سامنے رکھا، جسے سامنے رکھ کر بچوں سے کہانیاں لکھوائی گئیں۔ یہ کتاب فور کلر دبیز کاغذ میں شائع بھی ہوئی۔ یہ کہانی بہت پہلے انگریزی میں ٹرانسلیٹ ہوئی 'دی کرو کرونیکل The Crow Chronicle کے نام سے۔ جسے جوگیند پال نے ساہتیہ اکادمی سے شائع ہونے والے 'کتھا' کلیکشن میں شامل کیا تھا۔

مشتاق احمد نوری کے اہم افسانوں میں 'جن کی سواری'، 'لمبے قد کا بونا'، 'چھت پر ٹھہری دھوپ'، 'لمبی ریس کا گھوڑا'، 'اعتبار، مرد، گہن چاند کا، شمائلہ، جادو گر، نظر بند، اور پھر ایسا ہوا، وردان'، 'وراثت' اور 'ترشول پر ٹنگی کہانی' اہم ہیں۔

ایسا کہا جاتا ہے کہ ہر فنکار کا عکس ان کی تحریروں میں ملتا ہے۔ اگر آپ مشتاق احمد نوری کے افسانوں میں ان کی شخصیت کا عکس تلاش کریں گے تو آپ کو شعوری یا لاشعوری طور پر وہ عکس ''جاڑے کی گلابی رات''، ''سچ'' وغیرہ میں آپ کو دیکھنے کو مل جائے گا۔ یہاں ''جاڑے کی گلابی رات'' کا اقتباس پیش ہے۔

''نیند کب آئی اس کا پتہ نہیں چل سکا مگر جب آنکھ کھلی تو خوب جم کر سو لینے کا احساس ہوا۔ آنکھیں پوری طرح کھول

کر دیکھا۔ کمرہ خالی تھا اور صبح کا اجالا پھیل گیا تھا۔ میں ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھا اور اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ میرا سامان سلامت تھا اور سوٹ کیس پر کاغذ کا ایک پرزہ پڑا تھا۔ میں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ لکھا تھا۔ ہمیں سوئے ہوئے مرد بہت اچھے لگتے ہیں اس لیے ٹرین آنے پر بھی آپ کو بیدار کرنے کی گستاخی نہیں کی.....صرف واپسی کا کرایہ چھوڑ کر آپ کی جیب خالی کر دی۔ ہاں سوٹ کیس سے بھی قیمتی سامان اڑا لیا ہے۔ آپ کی گھڑی گرچہ بہت قیمتی اور حسین ہے پھر بھی اسے رہنے دیا تا کہ آپ کو وقت کا احساس ہوتا رہے۔ امید ہے کہ گلابی کی یہ رات آپ ہمارے نام منسوب کریں گے۔'' افسانہ ''جاڑے کی گلابی رات''

مشتاق احمد نوری کے زیادہ تر افسانے حقیقت کے قریب نظر آتے ہیں۔ سماج میں پھیلی ہوئی بدامنی اور ملکی مسائل کو زیادہ تر انھوں نے اپنے افسانے میں جگہ دی ہے اور اپنی کہانیوں کے ذریعہ گھناونے سماج کو آئینہ دکھانے کا کام بھی کیا ہے۔ شکیل الرحمٰن نے مشتاق احمد نوری کے افسانوں کے متعلق اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے۔

''مشتاق احمد نوری کئی بہت اچھے افسانے کے خالق ہیں۔ یہ افسانے اردو فکشن میں اضافہ ہیں، مثلاً 'جن کی سواری'، 'وردان'، 'لمبی ریس کا گھوڑا'، 'خودکشی'، 'بند آنکھوں کا سفر'، 'ایک مٹھی تم'، 'کیل اندر اندر'، 'گلاب بابو'، 'حرف آخر'، 'کائیں کائیں'، 'پتھر کی لکیر' وغیرہ۔ ان کے فن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو محسوس ہوگا کہ افسانہ نگار معمولی واقعات و کردار کے اندر غیر معمولی سچائیوں کو پانے کی کوشش کرتا ہے اور اسی میں کامیابی ہوتی ہے۔ 'لمبے قد کا بونا' اس بات کی عمدہ مثال ہے معمولی واقعات اور معمولی عام جانے پہچانے کردار کے اندر افسانہ نگار نے غیر معمولی سچائی تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔''

اردو افسانے میں ایک بونے کی سائیکی (Psycha) میں جھانکنے کی یہ غالباً پہلی کوشش ہے۔ فکشن کا اچھا فنکار زندگی اور اس کے مسائل کے تجربے حاصل تو کرتا ہے، لیکن ساتھ ہی کسی نہ کسی معجزے کی تلاش میں بھی رہتا ہے۔ معجزہ ہو جاتا ہے تو وہ خود حیرت زدہ رہ جاتا ہے اور اپنے کردار کے باطن کا عطا کیا ہوا تحیر قاری کے حوالے اس طرح کر دیتا ہے کہ وہ معجزہ اور فنکار کا تحیر قاری کا جمالیاتی تجربہ بن جاتا ہے۔'' (زبان و ادب، جون 2016، ص 61)

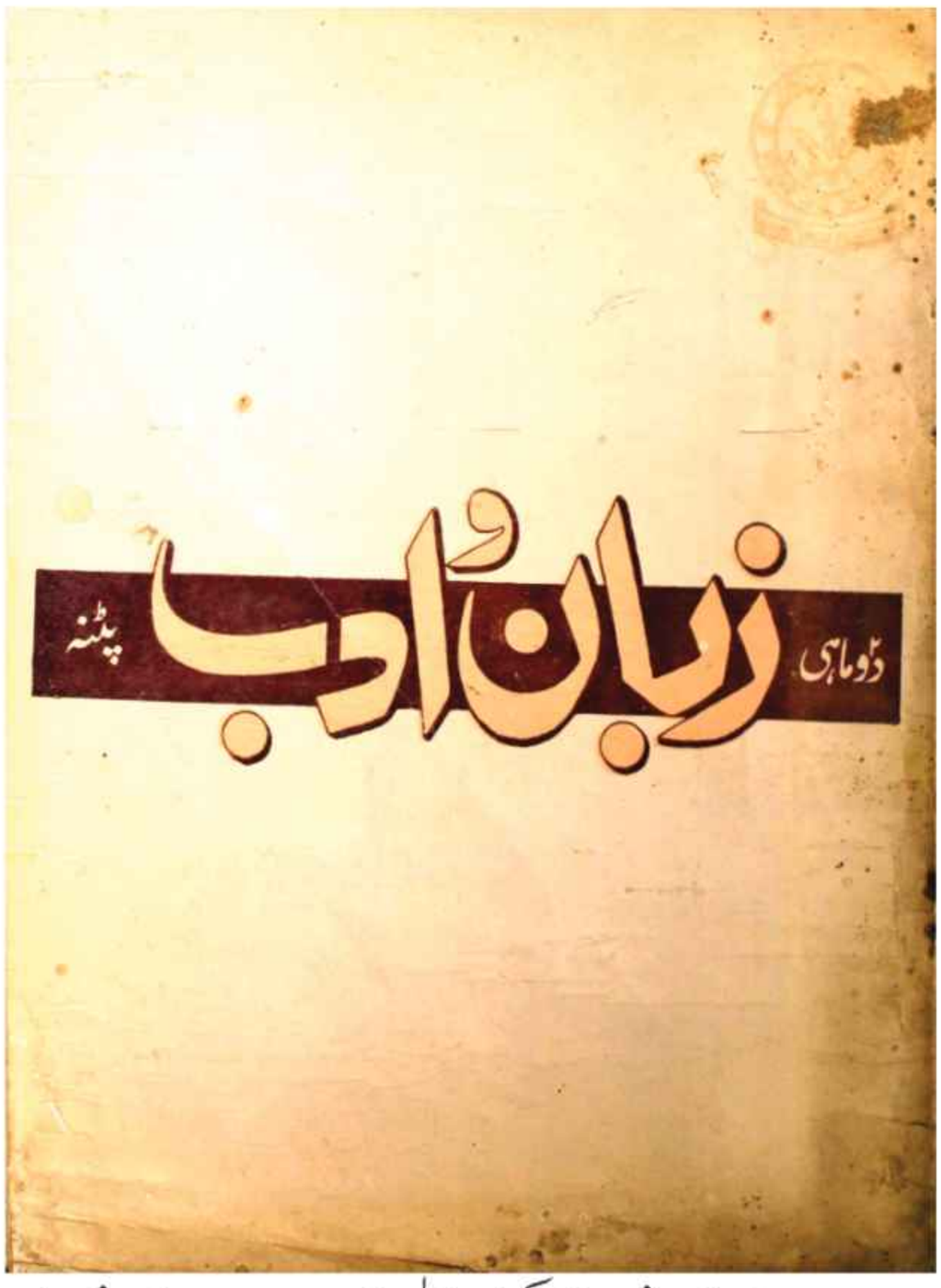

یہاں جس کہانی کا ذکر شکیل الرحمٰن کر رہے ہیں وہ کہانی 'لمبے قد کا بونا' ہے۔ اس کہانی کا مرکزی کردار راجن نام کا بونا ہے۔ جس کے ارد گرد پوری کہانی گھومتی ہے۔ راجن کا تعلق کسی معمولی گھرانے سے نہیں ہے بلکہ پورنیہ شہر کے ایک دولت مند تاجر گھرانے کا ایک فرد ہے۔ اس نے انگریزی لٹریچر میں آنرز کر رکھی ہے۔ وہ بھائیوں میں سب سے چھوٹا ہے۔ جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے کہ گھر میں جو چھوٹا ہوتا ہے اسے والدین کے ساتھ ساتھ گھر کے دیگر افراد کی طرف سے بھی زیادہ پیار ملتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جب راجن بڑا ہونے لگتا ہے اور شعور کی کونپلیں پھوٹنے لگتی ہیں تب اسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کے والدین اپنے تمام

بیٹوں سے زیادہ جو پیار اس پر لُٹا رہے ہیں وہ دراصل ان کا پیار نہیں ہے بلکہ اس کے ناٹے ہونے کی وجہ سے وہ اس سے ہمدردی رکھتے ہیں۔ رحم کا جذبہ رکھتے ہیں۔ یہی بات اسے دن رات پریشان کرتی رہتی ہے۔ وہ سوتے جاگتے صرف یہی سوچتا ہے کہ رحم کے بدلے ملا ہوا یہ پیار، پیار نہیں ہے بلکہ تضحیک ہے۔

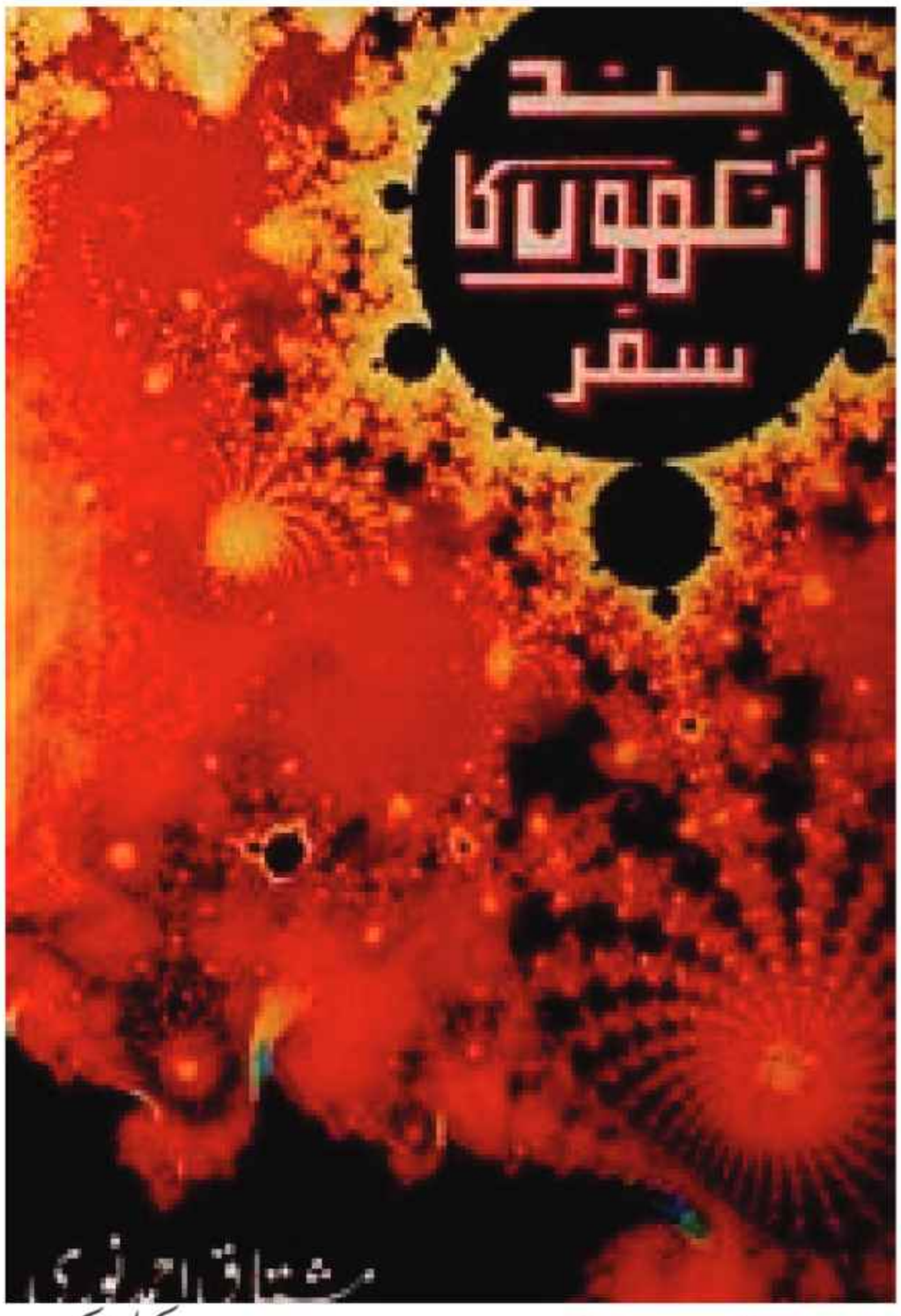

مشتاق احمد نوری جس سماج میں رہتے ہیں اسے اپنی کھلی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ سماج کے جو مسائل ہیں انھیں افسانے کے قالب میں ڈھالتے بھی ہیں۔ اس سلسلے میں حقانی القاسمی لکھتے ہیں۔

''مشتاق احمد نوری نے جس سماج کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اسے اپنی تخلیقی کائنات کا حصّہ بنا لیا ہے۔ ان کی نثر خوبصورت ہوتی ہے اور وہ لفظوں کا خلاقانہ استعمال کرتے ہیں۔ کہیں کہیں اسراف بیجا بھی ہے مگر زیادہ تر کہانیاں ایسی ہیں جن میں لفظوں کا ستعمال بقدر کفایت ہی کیا گیا ہے۔ جذبات نگاری مشکل چیز ہے اور اس مشکل مرحلے کو انھوں نے بآسانی طے کیا ہے۔''

(حقانی القاسمی، بحوالہ اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر احمد صغیر، ص 79)

ڈاکٹر قیام نیّر ان کے زبان و بیان کے متعلق اپنی کتاب بہار میں تخلیقی نثر (آزادی کے بعد) جلد اول میں لکھتے ہیں۔

''مشتاق احمد نوری نے اپنی زندگی میں جو محسوس کیا، دیکھا اور جھیلا اسے ہی افسانوں میں برتا ہے۔ سیاسی، سماجی اور اخلاقی مسائل پر بھی انھوں نے قلم اٹھایا ہے۔ انھوں نے کہیں کہیں نفسیاتی گرہیں کھولنے اور کہیں کہیں حسن و عشق اور زلف و رخسار کی باتیں بھی کی ہیں۔ زبان و بیان میں روانی، دلکشی ہے۔ الفاظ کی نشست اور جملے کی ساخت میں بڑی فنکاری نظر آتی ہے۔''

(بہار میں تخلیقی نثر (آزادی کے بعد) جلد اول، ڈاکٹر قیام نیّر۔ ص 247)

مشتاق احمد نوری نے اپنے افسانوں میں معمولی سے معمولی کرداروں کو بھی غیر معمولی بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے افسانوں میں موضوعات کا تنوع ہمیں دیکھنے کو ملتا ہے۔ دلکش اسلوب اور شاندار تکنیک کا امتزاج ان کی تحریر کو پُر کشش بنا دیتی ہے۔ موضوعات اور کہانی کے ڈیمانڈ کی مناسبت سے ان کے یہاں بیانیہ تکنیک کا خوبصورت استعمال نظر آتا ہے۔ مکالمے چست درست اور موقع و محل کی مناسبت سے چسپاں کیے جاتے ہیں۔ چند ایک کہانیوں میں واحد متکلم اور راوی غائب کا بھی استعمال تکنیکی اعتبار سے ہوا ہے۔ وہ زیادہ تر افسانوں میں کوئی نہ کوئی تجربہ کرتے ہوئے ہمیں دکھائی دیتے ہیں۔

شہاب ظفر اعظمی نے اپنی تنقیدی کتاب ''مطالعات فکشن'' میں ایک جگہ مشتاق احمد نوری کے افسانوں میں تجربات و مشاہدات کے حوالے سے لکھا ہے۔ اسے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

''مشتاق احمد نوری کی کئی کہانیاں تجربے اور مشاہدے کے امتزاج سے وجود میں آئی ہیں۔ 'شمائلہ'، 'وردان'، 'گہن چاند کا' وغیرہ ایسی ہی کہانیاں ہیں۔ 'وردان' ایک بدصورت لڑکی کی کہانی ہے جو محبت اور چاہت کی تلاش میں نفسیاتی طور پر

ایسی مریض بن جاتی ہے کہ ریپ یا زنا بالجبر ہی اس کی تسکین کا باعث ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے پروفیسر محمد محسن کے افسانے 'انوکھی مسکراہٹ' میں کسی کی موت لڑکی کے لبوں کی زندگی بن جاتی ہے۔ 'شمائلہ' ایک بچی کی معصومیت، محبت اور جذباتی رشتے کی کہانی ہے، جس نے اپنی معصوم اداؤں، بے لوث خدمات اور پیار سے گھر کے تمام افراد کے ساتھ ایسا مضبوط رشتہ بنالیا ہے کہ اس کی موت ہر فرد کو محبت اور معصومیت کی موت محسوس ہوتی ہے۔ 'اعتبار' کی کہانی شک وشبہ سے پر موجودہ معاشرے کا قصہ ہے جہاں لوگ مکان بھی کرائے دار کو اس کا مذہب پوچھ کر دے رہے ہیں۔ اسی ماحول میں کچھ لوگ اپنی مذہبی رواداری، انسانیت اور نیک دلی سے امید کی شمع روشن رکھتے ہیں۔ ایسے ہی کردار مسٹر شکلا جن کی زبان بظاہر جتنی تلخ اور نفرت انگیز ہے دل اتنا ہی روشن میٹھا اور شفاف ہے۔ یہ فرقہ وارانہ فساد اور عصبیت کے نتیجے میں بے گھری اور دربدری کا شکار خاندان کی کہانی ہے''

(شہاب ظفر اعظمی۔ تنقیدی کتاب 'مطالعات فکشن'، ص174)

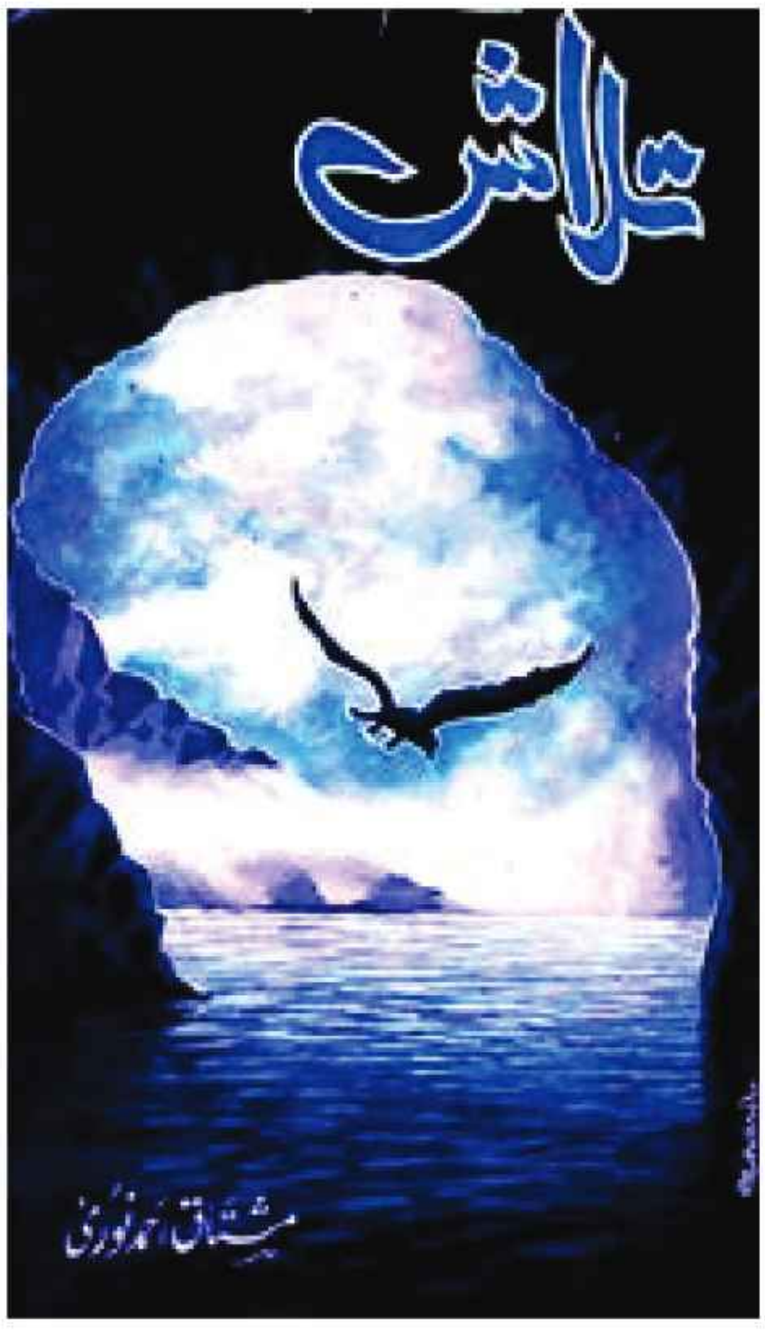

افسانہ ''کائیں کائیں'' میں انھوں نے انسانی معاشرہ جس تیز سے پستی کی طرف جا رہا ہے، اس کا اشارہ اولڈ ایج ہوم کی صورت میں بخوبی کیا ہے اور یہ دکھایا ہے کہ آج کی اولادیں جس ماں باپ کو اپنا بوجھ سمجھتے ہیں وہ باپ اسے جتنے جتن سے بڑا کرتا ہے پڑھاتا لکھاتا ہے اور اس کی شادی کر کے اسے ایک نئی زندگی سے ہمکنار کرتا ہے، لیکن جب اسے خود اولاد کے سہارے کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ اولاد اسے بوجھ سمجھتا ہے اور اولڈ ایج ہوم کا راستہ دکھاتا ہے۔

مشتاق احمد نوری کے افسانوں کا مطالعہ کرنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی ازم کا پروپگنڈا نہیں کرتے ہیں بلکہ جو اچھا لگتا ہے اسے ضرورت کے حساب سے استعمال کرتے ہیں۔ وہ اپنے افسانوں کے ذریعہ سماج کے چہرے پر جو نقاب چڑھا ہے اسے اپنی تحریروں کے ذریعہ نوچ کر باہر کر دینا چاہتے ہیں اور سماج کا حقیقی چہرہ لوگوں کے سامنے کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس میں وہ کامیاب بھی ہوئے ہیں۔ افسانہ نگار کا یہی تو وہ کمال ہے کہ جس سماج میں وہ رہ رہا ہے وہاں کی عکاسی اپنی تحریروں میں کرے اور اپنے فن کے حوالے سے اس وقت کا ادبی دستاویز قاری کے سامنے پیش کرے۔

مشتاق احمد نوری کو کئی اہم ایوارڈ ملے ہیں جن میں 'بزم صدف انٹرنیشنل ایوارڈ (2017) محفل اردو ایوارڈ، کرناٹک ساہتیہ اکادمی آنریری ایوارڈ (2009) بزم اردو قطر ایوارڈ 2017) اہم ہیں۔ اس کے علاوہ بھی کئی انعامات اور اعزازات انھیں ملک اور بیرون ملک سے مل چکے ہیں۔

عہد حاضر کے افسانہ نگاروں پر جب بھی بات ہوگی تو مشتاق احمد نوری کے افسانوں پر بات کئے بغیر نقاد ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ پائیں گے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے وہ آج ہمارے عہد میں جی رہے ہیں۔ اللہ انھیں اور بھی کامیابیاں عطا کرے۔ آمین۔

Ambar Fashan
Research Scholar .
Department of URDU,
Tilka Manjhi Bhagalpur University
Bhagalpur- 812007 (Bihar)

تقسیمِ ہند کا المیہ اور ناول 'پنجر'

عبدالوارث

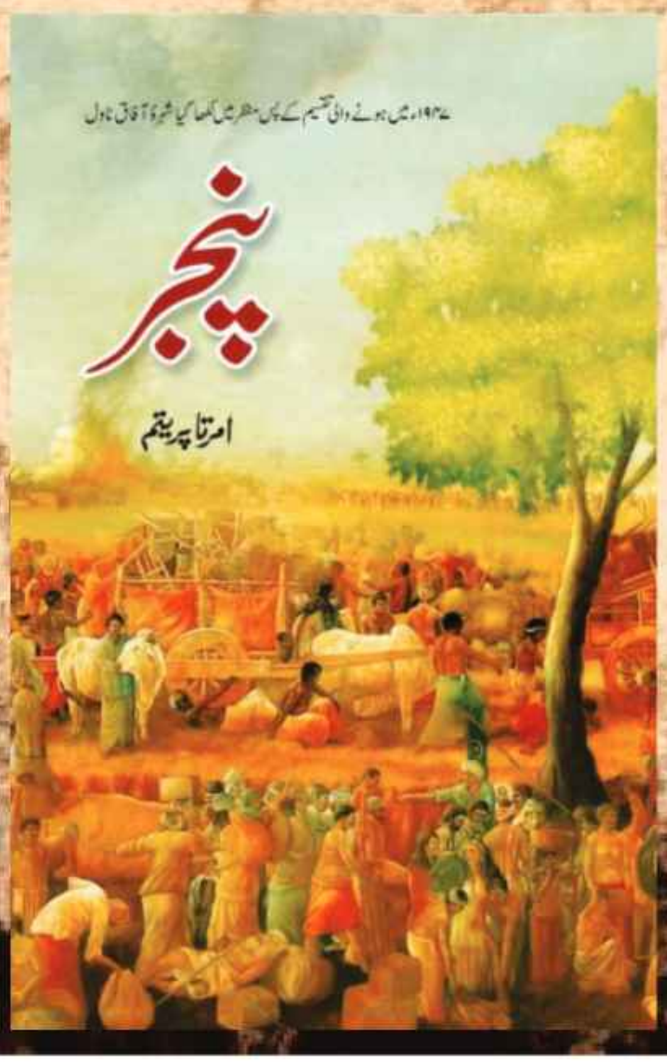

برصغیر کی تاریخ میں تقسیمِ ہند ایک ایسا گہرا زخم ہے جس کی ٹیس انسانی معاشرے کے لیے آج بھی ناقابلِ برداشت ہے۔ اس کرب ناک سانحے نے انسانی ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ اردو میں بھی اس دل دوز واقعے پر بہت کچھ لکھا گیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اردو، ہندی اور پنجابی وغیرہ کی جن کہانیوں اور ناولوں میں اس سانحے کو موضوع بنایا گیا ان میں امرتا پریتم کا معروف ناول 'پنجر' بھی شامل ہے۔ امرتا پریتم نے تقسیمِ ہند سے قبل اور اس کے بعد پیدا ہونے والے خوف ناک مناظر کو بہت قریب سے دیکھا۔ مہاجرین میں امرتا پریتم بھی شامل تھیں۔ انھوں نے اہل خانہ کے ساتھ لاہور سے ہجرت کرتے ہوئے پہلے دہرادون اور پھر دہلی میں سکونت اختیار کی۔ گویا مہاجرین کے مسائل و مصائب کی وہ عینی شاہد تھیں۔ ناول ''پنجر'' اس ہولناک سانحے کا شکار ایک عورت کی کہانی ہے۔ یہ ناول 1951 میں منظر عام پر آیا جو گورمکھی میں لکھا گیا۔ اس کے بعد اسے کئی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔ صرف یہ ناول ہی نہیں ہے بلکہ امرتا پریتم کی کم و بیش تمام تخلیقات انگریزی، فرانسیسی، یوگوسلاویہ، اسپینش، البینین کے ساتھ ساتھ ہندوستانی زبانوں میں گجراتی، بنگالی، مراٹھی، ملیالم، کنڑ، سندھی، آسامی، اڑیا اور ہندی میں بھی ترجمہ ہوئی ہیں۔ ناول 'پنجر' کا اردو ترجمہ ظفر ادیب نے 1957 میں 'یہ خلش کہاں سے ہوتی' کے عنوان سے کیا۔ اس ناول کی شہرت و مقبولیت میں غیر معمولی اضافہ اس وقت ہوا جب اسے فلم کے پردے پر پیش کیا گیا۔ فلم کا نام بھی ''پنجر'' ہے جو 2003 میں منظر عام پر آئی۔ اس فلم کے ہدایت کار چندر پرکاش دیویدی ہیں۔ ارمیلا ماتونڈکر نے پارو کے کردار میں، منوج واجپائی نے رشید کے کردار میں اور سنجے سوری نے رام چند کے کردار کی شکل میں اپنی بہترین اداکاری سے فلم میں چار چاند لگا دیے۔ فلمی دنیا کے ہر دل عزیز شاعر و نغمہ نگار گلزار نے اس فلم کے نغمے لکھے۔ یہاں اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ 'پنجر' ناول اور فلم دونوں کے درمیان بہت سی مماثلتیں ہیں۔ حالانکہ جب کسی کہانی یا ناول کو پردے پر پیش کیا جاتا ہے تو عموماً ان میں خاصا فرق واقع ہو جاتا ہے۔ مثلاً ناول امراؤ جان ادا، گئودان، خدا کی بستی، ایک چادر میلی سی، آنگن وغیرہ پر جب فلمیں اور سیریلس بنے تو اصل کہانیوں اور فلموں میں ہمیں نمایاں فرق دیکھنے کو ملا ہے اگرچہ کہ ان کی کہانی اور پلاٹ بنیادی طور پر ایک ہی ہیں۔ ظاہر ہے فلم کے کچھ اپنے تقاضے ہوتے ہیں، وہ تمام چیزیں ناول سے بعینہٖ مستعار نہیں لے سکتی ہے۔ لیکن 'پنجر'' ناول اور فلم دونوں میں بہت سی مماثلتیں ہیں۔ حتیٰ کہ ناول کے بعض کردار جو مکالمے ادا کرتے ہیں وہی فلم کے ڈائلاگ (Dialogues) بھی ہیں۔ بہرحال کچھ اس طرح ایک اہم ناول ادبی حلقے سے نکل کر بصری

پیکر میں منظرِ عام پر آیا اور بے پناہ شہرت حاصل کی۔

جیسا کہ عرض کیا گیا کہ 'پنجر' ایک معصوم مغویہ عورت پارو کی اذیت ناک کہانی ہے۔ اس ناول میں دورانِ تقسیمِ ہند کے فسادات میں ہونے والی قتل و غارت گری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ امرتا پریتم ناول میں اس بات کی پرزور مذمت کرتی ہیں کہ اس سانحے میں کمزوروں اور مظلوموں پر کس قدر ظلم و ستم ڈھائے گئے بالخصوص عورتوں کی عصمت و عفت کو کس طرح داغ دار کیا گیا۔ تاریخ شاہد ہے کہ استحصال ہمیشہ کمزوروں کا ہی ہوتا ہے اسی لیے دنیا کی مختلف جنگوں میں عورتوں اور بچوں پر ظلم و ستم زیادہ ہوئے ہیں۔ اس ناول کے ذریعے امرتا پریتم اس بے رحم سماج سے یہ سوال کرتی نظر آتی ہیں کہ کیا انسانی معاشرے میں ہماری عورتیں محفوظ ہیں؟ مذہبی منافرت کی شکار عموماً عورتیں ہی کیوں ہوتی ہیں؟

ناول کا آغاز گجرات کے چھتووانی گاؤں کے ساہوکار کی لڑکی پارو سے ہوتا ہے۔ پارو ناول کا مرکزی کردار ہے اور پورا ناول اسی کے گرد گھومتا ہے۔ پندرہ سال کی پارو گھر کی بڑی بیٹی ہے۔ اس کے ایک چھوٹے بھائی اور تین بہنیں بھی ہیں۔ پارو کی شادی پاس کے گاؤں رتووال کے ایک شریف لڑکے رام چند سے طے ہوتی ہے اور ساتھ ہی پارو کے بھائی کی شادی رام چند کی بہن لاجو سے۔ لیکن اچانک ایک دن گاؤں کے شیخ گھرانے سے تعلق رکھنے والے رشید نامی نوجوان پارو کو اِغوا کر لیتا ہے۔ یہ رشید کے خاندان کی سوچی سمجھی سازش تھی۔ شیخ اور ساہوکار گھرانوں کے مابین ماضی سے خاندانی دشمنی چلی آ رہی تھی۔ جب گاؤں میں ہندوؤں کا بول بالا تھا تب پارو کے تاؤ نے رشید کی بوا کو اِغوا کیا تھا اور اپنے ساتھ جبراً تین دنوں تک رکھا تھا۔ اس کے بعد رشید کی بوا کو گھر سے نکال دیا گیا۔ اب چوں کہ گاؤں میں مسلمانوں کا غلبہ ہے چنانچہ رشید کے چچا اور رشتے دار رشید کو ورغلاتے ہیں اور اس سے خوب قول و قرار لیتے ہیں کہ اب وہ ساہوکار گھرانے کی بیٹی پارو کو لے بھاگے اور اس کے ساتھ وہی فعل بد کرے جو ماضی میں پارو کے تاؤ نے رشید کی بوا کے ساتھ کیا تھا۔ جیسا کہ درج بالا سطور میں یہ عرض کیا گیا کہ استحصال ہمیشہ کمزوروں بالخصوص عورتوں اور بچوں کا کیا جاتا ہے۔ ٹھیک یہاں بھی مذہبی دشمنی میں ظلم و تعدی کا شکار بارہا عورتیں ہی ہوئی ہیں۔ ماضی میں رشید کی بوا اور اب پارو مذہبی منافرت کے اس انتقام کی آگ میں جھلس رہی ہے۔

> **''پنجر' ایک معصوم مغویہ عورت پارو کی اذیت ناک کہانی ہے۔ اس ناول میں دورانِ تقسیمِ ہند کے فسادات میں ہونے والی قتل و غارت گری کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ امرتا پریتم ناول میں اس بات کی پرزور مذمت کرتی ہیں کہ اس سانحے میں کمزوروں اور مظلوموں پر کس قدر ظلم و ستم ڈھائے گئے۔''**

یہ صرف پارو کی کہانی نہیں بلکہ تقسیمِ ہند کے دوران سیکڑوں عورتوں کی کہانی ہے جو مذہبی منافرت کی شکار ہوئی تھیں۔ امرتا پریتم اس ناول کے ذریعے اس بے حس سماج کی سخت مذمت کرتی ہیں کہ جس میں مذہبی و خاندانی دشمنی کے انتقام کے لیے عورتوں کو اِغوا کیا جاتا ہے اور ان کا جنسی استحصال کیا جاتا ہے۔ پارو، رشید کے سامنے خوب گریہ وزاری کرتی ہے کہ وہ اسے آزاد کر دے تاکہ وہ اپنے گھر جا سکے۔ وہ کہتی ہے:

> ''تیری بوا کو میرے تاؤ نے اٹھایا۔ لیکن رشید! اس میں میرا کیا قصور ہے۔ ہائے میں تو کہیں کی بھی نہ رہی۔'' پارو کا منہ آنسوؤں سے بھیگ گیا۔
>
> ''یہی تو میں کہتا تھا۔ لیکن میرے چاچے مجھے ملامت کرتے تھے۔''
>
> ''تو رشید! تو نے ان کے کہنے میں آ کر مجھے مار ڈالا ہے۔'' پارو نے روتے روتے کہا۔(1)

بہرحال پندرہ دنوں کے بعد پارو کسی طرح رشید کے قبضے سے بھاگ نکلتی ہے اور اپنے گھر واپس پہنچتی ہے لیکن اس کے والدین

اسے یہ کہہ کر قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں کہ وہ اب پاک نہیں رہی۔ یہ بات واضح رہے کہ رشید نے پارو کے ساتھ کسی طرح کا جنسی رشتہ قائم نہیں کیا تھا کیوں کہ رشید نے اپنے رشتے دار بالخصوص اپنے چچا کے حکم پر پارو کو قصداً نہیں مجبوراً اِغوا کیا تھا۔ چوں کہ پارو ایک مسلمان کے گھر میں پندرہ دنوں تک رہی اس لیے اس کے والدین اسے قبول نہیں کرتے ہیں۔ پارو کے والدین اپنے دل پر پتھر رکھ کر پارو سے کہتے ہیں:

''بیٹی تیری قسمت، اب ہماری بس میں کچھ نہیں۔''

''ابھی شیخ گھرانے کے آدمی آجائیں گے تو ہمارے پورے کنبے کو ختم کر دیں گے۔''

''ہم تمھیں کہاں رکھیں گے، اب تجھ سے کون شادی کرے گا۔ تیرا دھرم گیا اور تیرا جنم گیا۔ اگر ہم ذرا بھی آواز نکالیں تو یہاں ہمارے خون کے ایک قطرے کا پتہ بھی نہ چلے گا۔۔۔''

''تو مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو۔'' پارو نے تڑپ کر کہا

''بیٹی پیدا ہوتے ہی مر جاتی، اب یہاں سے چلی جا۔ ابھی شیخ آتے ہوں گے۔ تیرے باپ اور بھائی کا کہیں بھی نشان نہیں ملے گا۔''(2)

یہاں امرتا پریتم نے اس ناول کے ذریعے سماج کے اس فعل قبیح کو پیش کیا ہے کہ جس میں لوگ خاندانی دشمنی کے انتقام اور مذہبی تعصب و منافرت کے لیے عورتوں کو نشانہ بنا کر ان کی آبرو ریزی کرتے ہیں۔ اس ناول کے ذریعے امرتا پریتم یہ سوال قائم کرتی ہے کہ دورانِ تقسیم ہونے والے مظالم میں پارو جیسی سیکڑوں عورتوں کی اس حالتِ زار کا ذمہ دار کون ہے؟ جس نے انہیں اس دوراہے پر لا کھڑا کیا کہ وہ اب اپنے گھر کی بھی نہیں رہیں، وہ عورتیں بے گناہ ہوتے ہوئے بھی سماجی جبر کا شکار بنیں۔ اس میں ان کی اپنی مرضی کا بالکل بھی دخل نہیں تھا بلکہ یہ وہ زخم ہے جو انہیں اس بے رحم سماج نے دیا ہے۔ ان کے ساتھ اتنا کچھ ہونے کے باوجود بھی یہ سماج ان سے ہمدردی نہیں رکھتا بلکہ انہیں اپنے ہی گھروں سے نکال باہر کیا جاتا ہے۔ پارو کے اس برے حال کا ذمہ دار صرف اور صرف یہ جابر و ظالم سماج ہے۔ امرتا پریتم نے پارو کے کردار میں تمام مغویہ خواتین کے مصائب و آلام اور مظالم کی داستان بیان کی ہے۔ ان کی نظر میں پارو ایک ایسا کردار ہے جس کے آئینے میں اس عہد کی تمام بے بس و لاچار اور ستم زدہ عورتوں کی تصویر کو دیکھا جا سکتا ہے۔

جب پارو کے گھر والے سماج اور برادری کے خوف سے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیتے ہیں تو ناچار پارو گھر سے نکلتی ہے اور بہت غمگین ہو کر اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر بیٹھتی ہے لیکن ایسے میں رشید اسے خودکشی کرنے سے بچا لیتا ہے اور اسے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ تیسرے دن رشید اس سے نکاح کرتا ہے اور اس کا نام حمیدہ رکھتا ہے۔ کبھی کبھی پارو اپنے ماضی کو یاد کرتی ہے اور کچھ اس طرح کی کیفیت سے دوچار ہوتی ہے۔

''پارو دن کی روشنی میں حمیدہ بن جاتی تھی اور رات کے اندھیرے میں پارو ہوتی تھی۔ لیکن وہ سوچتی تھی کہ وہ اصل میں حمیدہ ہے نہ پارو۔۔۔ وہ صرف ایک ڈھانچہ ہے۔ جس کا نہ کوئی روپ ہے نہ کوئی نام ہے۔''(3)

پارو ہی کی طرح ناول میں ایک کردار کمو ہے جس پر خوب ظلم و ستم ڈھائے جاتے ہیں۔ حالاں کہ فلم ''پنجر'' میں کمو نامی کوئی کردار پیش نہیں کیا گیا ہے جب کہ ناول میں یہ کردار موجود ہے۔ کمو کے باپ نے کسی دوسری عورت سے شادی کر لی ہے۔ کمو اپنے چچا کے پاس رہتی ہے۔ اس کی چچی اس پر بہت ظلم و زیادتی کرتی ہے اور اس سے سخت کام کرواتی ہے۔ پارو کو بیچاری کمو سے ہمدردی ہے لیکن پارو کے ساتھ ماضی میں جو کچھ ہوا اس کی بنا پر کمو کو اس سے ملنے نہیں دیا جاتا ہے۔ پارو کو بدنام زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ حالاں کہ پارو، کمو جیسی کئی عورتوں سے پوری ہمدردی رکھتی ہے۔ اسی دوران اس کے یہاں ایک لڑکے کی ولادت ہوتی ہے۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی دل و جان سے اس کی پرورش کرتی ہے۔ ایک دن رشید سخت بیمار پڑا اور پارو اس کی بھی پوری رات تیمارداری کرتی رہی۔ اتنا کچھ ہونے کے باوجود وہ رشید سے ہمدردی رکھتی ہے اور اس کے بچے سے مادرانہ شفقت برتتی ہے۔ باوجود اس کے یہ بے رحم سماج اس کو حقارت بھری

نگاہ سے دیکھتا ہے، اپنی عورتوں کو اس سے ملنے نہیں دیتا ہے اور اس کا سماجی بائیکاٹ بھی کرتا ہے۔ دراصل اس ناول میں امرتا پریتم معاشرے کے اس سفلہ پن کو ظاہر کرتی ہیں کہ وہ دکھ کی ماری پارو جیسی مادرانہ صفت رکھنے والی عورت کے ساتھ بھی بدسلوکی کرتا ہے۔

کمو کی طرح حالات کی ماری ہوئی ایک کردار ''پگلی'' ہے۔ پگلی دن بھر اِدھر اُدھر تن بدن سے بے خبر بھٹکتی پھرتی ہے۔ گاؤں کی عورتیں اس کے سامنے کچھ کھانے کا سامان اور کپڑے رکھ دیتی ہیں۔ گاؤں کے شریر بچے اس کے پیچھے بھاگتے ہیں اور اس کو پتھر مارتے ہیں۔ اچانک ایک دن پارو اس پگلی کو غور سے دیکھتی ہے، تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ پگلی حاملہ ہے۔ پارو اس بے رحم و بے حس مرد اساس معاشرے کو خوب لعنت ملامت کرتی ہے کہ یہ وحشی معاشرہ ایک نیم جان بدحواس لڑکی کو بھی نہیں چھوڑتا۔ وہ کہتی ہے:

''وہ کیسا مرد ہوگا۔ وہ کیسا وحشی ہوگا جس نے ایسی پاگل عورت کا یہ حال کر دیا۔ سب عورتیں پھٹکار بھیجتی تھیں۔ سب کا دل خون کے آنسو روتا، پگلی جو حسین تھی نہ جوان تھی۔ جو گوشت کا بے ہوش لوتھڑا تھی۔ ہڈیوں کا ایک لڑکھڑاتا ڈھانچہ تھی۔ مردوں نے اسے بھی نوچ نوچ کر کھا لیا تھا۔ پارو یہی سوچ سوچ کر غم و غصے کی آگ میں جلنے لگی۔۔''(4)

دراصل اس ناول کے ذریعے امرتا پریتم مرد اساس معاشرے کی درندگی و بہیمیت کو اجاگر کرتی ہیں کہ وہ اپنی جنسی بھوک کو مٹانے کے لیے ایک پگلی کو بھی نہیں چھوڑتا۔ ناول میں پگلی کی درد بھری کہانی کے آئینے میں ان تمام عورتوں کی داستانِ غم کو بھی پیش کیا گیا ہے جو دوران تقسیم بلوائیوں کی درندگی کا شکار بنیں۔

رام چند کی بہن لاجو بھی تقسیمِ ہند کے دوران ہونے والی وحشیانہ قتل و غارت گری کا شکار بنی۔ چوں کہ رام چند کے گاؤں میں مسلمانوں کی اکثریت تھی جس کی وجہ سے ہندوؤں کو وہ گاؤں چھوڑنا پڑا۔ دورانِ ہجرت لاجو (جو پارو کے بھائی کی بیوی بھی ہے) کو بلوائیوں نے اِغوا کر لیا۔ اللہ دتہ اور اس کی ماں نے لاجو کے گھر پر قبضہ کیا اور اس کو اس کے اپنے ہی گھر میں قید کر رکھا تھا۔ ادھر پارو فساد کی ماری ایک ہندو لڑکی کو بلوائیوں سے بچا کر قافلے میں جا رہے رام چند کے سپرد کر دیتی ہے تا کہ وہ لڑکی اپنے لوگوں سے مل سکے۔ رات کے وقت کیمپوں میں پناہ گزیں عورتوں کو فسادی اٹھا لے جاتے اور ان کا جنسی استحصال کرتے۔ ایسا بالکل بھی نہیں ہے کہ یہ فسادی صرف اپنے مخالف مذہب یا قوم کی ہی عورتوں کو اغوا کرتے اور ان کی آبرو ریزی کرتے بلکہ ان کی درندگی و بہیمیت کا یہ عالم تھا کہ بعض دفعہ اپنی ہی قوم کی عورتوں کی عزت پر ہاتھ ڈالتے اور ان کی عفت کو داغ دار کرتے۔ بہر کیف قافلے میں رام چند پارو سے التجا کرتا ہے کہ وہ اس کی بہن لاجو کو کسی طرح تلاش کرے۔ پارو رشید کی مدد سے لاجو کو ڈھونڈ نکالتی ہے اور اس کو اپنے ہی گھر میں گاؤں والوں سے چھپا کر رکھتی ہے۔ رات کی تاریکی میں پارو اور لاجو اپنی اپنی قسمت کو روتی ہیں اور کچھ اس طرح کی سرگوشیاں کرتی ہیں:

''میری ماں کی قسمت، اس کی بیٹی بھی جیتے جی مرگئی اور بہو بھی۔۔۔'' پارو نے کہا اور پارو اور لاجو دونوں رو پڑیں۔

''تو جب وہاں جائے گی اور میری ماں سے ملے گی تو اس سے کہنا کہ مجھ جیتی کا منھ تو دیکھ لے۔'' پارو نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

''میں.....میں وہاں کیا جاؤں گی....''

''تو اپنے گھر جائے گی، اپنے خاوند کے پاس، اپنے بھائی کے پاس۔''

''میں جیتے جی مرگئی ہوں، مجھے کون ساتھ رکھے گا۔''

''نہیں لاجو! میں جیتے جی یہ بے انصافی نہ ہونے دوں گی، تو اپنے گھر جائے گی۔ اس میں تیرا کیا قصور ہے۔''

''لیکن تیرا کیا قصور تھا۔'' تجھے ابھی تک گھر والوں نے قبول نہیں کیا۔''

''میری بات اور تھی، لاجو!''

''کیوں تیری بات اور تھی؟ تو کیا اپنی مرضی سے آئی تھی۔ تو بھی تو مجبوراً۔''

''ہاں ، لاجو! لیکن اس وقت میں اکیلی تھی ۔ میرے ماں باپ کا حوصلہ نہ پڑا کہ وہ لوگوں کی باتیں سن سکیں اور میرے ماں باپ نے اپنی انتڑیاں کاٹ ڈالیں ۔ اب کسی ایک کو نہیں سب کے دل کو لگی ہوئی ہے ۔''

''نہیں، پارو! میری قسمت اچھی ہوتی تو میرے ساتھ یہ ظلم ہی نہ ہوتا۔ مجھے معلوم ہے مجھے کوئی قبول نہیں کرے گا۔''5

یہاں لاجو کا کہنا بالکل درست ہے کہ پارو بھی تو جبراً اِغوا کی گئی تھی جب اس کے گھر والوں نے سماج کے خوف سے اسے قبول نہیں کیا تو لاجو کو کیسے کریں گے؟ لیکن دورانِ تقسیم کچھ ایسی صورتِ حال تھی جس کے تحت لوگ مغویہ عورتوں کو قبول تو کر رہے تھے مگر دل سے نہیں ۔اب لوگ اپنی عورتوں سے اس طرح کے معاملات نہیں رکھتے جس طرح پہلے رکھتے تھے۔ اس سیاق میں راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ''لاجونتی'' بالخصوص قابلِ ذکر ہے۔ دراصل مغویہ عورتوں کے مسائل پر ہمارے فن کاروں نے توجہ دی ہے اور ان کو اپنی تخلیقات کا موضوع بھی بنایا ہے ۔جن فکشن نگاروں نے فساد زدہ عورتوں کو اپنے ناولوں میں جگہ دی ان میں امرتا پریتم کا یہ ناول کافی اہمیت کا حامل ہے۔

بالآخر پارو اور رشید، لاجو کو سرحد پر اس کے بھائی رام چند کے سپرد کر دیتے ہیں ۔ یہاں پارو کا بھائی بھی پارو سے یہ گزارش کرتا ہے کہ وہ بھی اس کے ساتھ ہندوستان چلے لیکن پارو اپنے بھائی کو یہ تاکید کرتی ہے کہ وہ لاجو کا ہمیشہ ساتھ نبھائے اور کبھی اس کی ناقدری نہ کرے۔ وہ مزید کہتی ہے:

''لاجو اپنے گھر چلی جائے تو سمجھنا کہ پارو بھی اس کے ساتھ آ گئی ہے ۔ میرے لئے اب یہیں ٹھکانا ہے۔۔'' پارو نے لاری پر چڑھتے ہوئے بھائی سے کہا۔

''چاہے کوئی ہندو لڑکی ہو ، چاہے مسلمان ، جو بھی لڑکی ٹھکانے پر پہنچ رہی ہے، سمجھو کہ اسی کے ساتھ پارو کی روح بھی ٹھکانے پر پہنچ رہی ہے، پارو نے دل ہی دل میں کہا اور دونوں آنکھیں جھکا کر رام چند کو آخری پرنام کیا۔

لاری چل پڑی تھی اور خالی سڑک پر گرد اڑنے لگی تھی۔''6

ناول کا اختتام بہت تکلیف دہ ہے ۔ جب ہم اس ناول کے خواتین کرداروں پر غور کرتے ہیں تو ان میں پارو ہی واحد کردار ہے جو تمام مصیبتوں کو جھیلتے ہوئے حالات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔ اس کی یہ اولین کوشش ہوتی ہے کہ جن اذیتوں کا شکار وہ خود ہوئی ہے ان کا شکار کوئی دوسری لڑکی نہ ہو۔ اس کی یہ جرأت مندانہ سوچ ہی اسے باقی کرداروں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس طرح پارو اس ناول کے سب سے محترک اور جاندار کردار کے طور پر ابھر کر سامنے آتی ہے۔

مختصراً ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناول ''پنجر'' میں تقسیمِ ملک کے فتنے وفسادات کی عمدہ منظر کشی تو کی ہی گئی ہے ساتھ ہی اس سانحے میں عورتوں کے ساتھ کس طرح کا ناروا سلوک کیا گیا، ان کو کن کن مسائل و مصائب سے دوچار ہونا پڑا اور ان کا کس طرح جنسی استحصال کیا گیا، ان تمام موضوعات و مسائل کو بھی امرتا پریتم نے نہایت عمدگی سے پیش کیا ہے ۔ امرتا پریتم کو کردار نگاری پر بھی دسترس حاصل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول میں مختلف اور متنوع کردار موجود ہیں ۔ لہذا کردار نگاری کے لحاظ سے بھی ''پنجر'' ایک کامیاب ناول ہے۔

حوالے

1 پریتم، امرتا، ناول پنجر، سیمانت پرکاشن، نئی دہلی، 2004، ص، 20

2 ایضاً، ص، 23 اور 24

3 ایضاً، ص، 27

4 ایضاً، ص، 45

5 ایضاً، ص، 103

6 ایضاً، ص، 112

❐❖❐

Abdul Waris
Research Scholar
Centre of Indian Languages
Jawaharlal Nehru University
Sutlej Hostel (Room No 123)
New Delhi-110067

گلشن عبداللہ

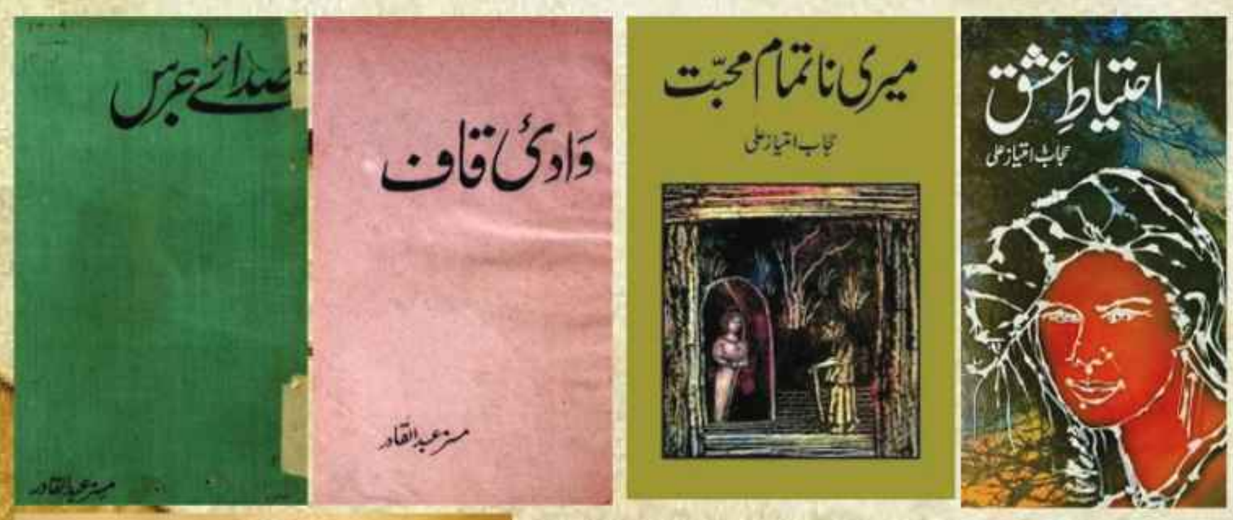

فراموش کردہ ابتدائی خواتین افسانہ نگار

اُردو افسانے کی اولیت کا مسئلہ برسوں تک زیر بحث رہا کیونکہ اُردو فکشن کے نامور نقاد اور محقق پروفیسر قمر رئیس نے آج سے پچاس برس پہلے لکھا:

''پریم چند کو اُردو مختصر افسانے کا بانی کہنا درست نہیں ہے۔ مختصر افسانے کے نمونے ان سے بہت قبل دلگداز، اودھ پنچ، معارف علی گڑھ ماہنامہ خاتون خذنگ نظر، مخزن، الناظر، بیسویں صدی لاہور اور دوسرے رسائل میں ملتے ہیں۔ پریم چند نے پہلا افسانہ دنیا کا سب سے انمول رتن 1906 میں لکھا، جب کہ سید علی محمد شکیل کی کہانی، اے صبا آرزو کہ خاک شدہ دلگداز اکتوبر 1888 میں سجاد حیدر یلدرم کا پہلا افسانہ مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ معارف علی گڑھ اگست 1900 میں اور علی محمد بان کی پور کا افسانہ ایک پُرانی دیوار مخزن اپریل 1904 میں شائع ہوئے''1

اس کے بعد یہ بحث برسوں تک چلتی رہی اور کچھ لوگ جن میں پروفیسر احتشام حسین سید معین الرحمٰن خاص شامل ہیں سجاد حیدر یلدرم کے افسانے' مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ' معارف اگست 1900 'نشے کی پہلی ترنگ' معارف اکتوبر 1900 کو پہلا افسانہ تسلیم کرنے لگے۔ کچھ لوگ سرسیّد احمد خان کے مضمون 'گزرا ہوا زمانہ' 1873 کو بھی افسانہ سمجھنے لگے۔

خیر اکثر علاقوں یا بہت سارے ممالک میں بھی دیکھا گیا ہے کہ ڈراموں میں پہلے پہل عورت کا پارٹ خوبصورت لڑکوں سے کروایا جاتا ہے، وہ اس لیے کیونکہ لڑکیوں کا اسٹیج پر آنا معیوب سمجھا جاتا ہے، پھر آہستہ آہستہ حالات بدل جاتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اُردو افسانے کے ساتھ بھی ابتدا میں ایسا ہی کچھ ہوا۔ اُردو افسانے کی شروعات جب ہوئی، عورتیں افسانے لکھنے میں عار محسوس کرنے لگیں اور اسطرح مردوں نے تجرباتی بنیادوں پر عورتوں کے فرضی ناموں سے 'عصمت' اور 'تمدن' نامی رسالوں میں مختلف افسانے شائع کیے۔ اس کام میں علامہ راشد الخیری پیش پیش رہے۔ ان کے عہد میں سرسیّد کی اصلاحی تحریک اپنے عروج پر تھی۔ اور ان کے زیر اثر وہ بھی فکشن لکھتے تھے اور دوسروں سے لکھواتے تھے۔ خاص کر انھوں نے عورتوں کے لیے 'عصمت' (1908) جیسا رسالہ جاری کیا۔ پھر یکے بعد دیگر ''سہیلی' اور 'جوہر نسواں' بھی جاری کیے۔ منشی پریم چند نے بھی کئی افسانے ہندی میں مسز پریم چند کے نام سے شائع کیے۔ حالانکہ دہلی میں 1888 میں مولوی سید احمد دہلوی

(فرہنگ آصفیہ) نے اخبار النساء نکالا۔ اس کام میں سجاد حیدر یلدرم کی کاوشوں کو بھی یاد کیا جاتا ہے۔ کیونکہ انھوں نے ترکی کی معروف ادیبہ خالدہ ادیب خانم کے افسانوں کا اُردو ترجمہ کر کے یہاں کی عورتوں کو فکشن لکھنے کیلیے اُکسایا۔ جس میں سب سے پہلے ان کی بیوی کا نام لیا جا سکتا ہے۔

نذر سجاد حیدر یلدرم (1892-1967) کا اصل نام نذر زہرا تھا۔ جنکا تعلق سیالکوٹ پنجاب کے ایک معزز گھرانے سے تھا۔ ان کی تعلیم و تربیت گھر پر ہی ہوئی اور وہ 'تہذیب نسواں' لاہور اور عصمت (دہلی) کے لیے ابتدائی عمر سے ہی لکھنے لگی۔ وہ 'تعلیم نسواں' کے بارے میں بنت نذر الباقر کے نام سے لکھتی تھی۔ ان کے والدین مشہور صحافی دانشور ممتاز علی کے قریبی دوست تھے۔ 1912 میں ممتاز علی نے نیار سالہ ''پھول'' جاری کر کے نذر کو اس کی ادارت سونپ دی، اسی دور میں ان کی شادی معروف ادیب اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے رجسٹرار سجاد حیدر یلدرم (1880-1943) سے ہوئی۔ اس طرح اپنے شوہر کی رہنمائی میں انھوں نے اختر النساء (1910)، بیگم آہ، مظلوماں، جانباز ثریا، نجمہ، مذہب اور عشق جیسے ناول اور افسانے لکھے۔ ان کی ڈائری بھی ان کی بیٹی قرۃ العین حیدر نے ''گذشتہ برسوں کی برف'' کے عنوان سے شائع کروائی۔2

در اصل نذر سجاد کا دور تعلیمی اور سماجی لحاظ سے برصغیر کی عورتوں کے لیے بہت ہی کٹھن تھا اور انھوں اپنی تحریروں میں خاص کر افسانوں کے ذریعے عورتوں کے لیے کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے راہ ہموار کی۔ ان کے افسانے 'نجمہ' میں مشرقی و مغربی اقدار کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔ اسی لیے میسرہ اختر نے ان کے بارے میں لکھا ہے:

''نذر سجاد حیدر نے جس قسم کی زندگی جی لی، اسی طرز پر ان کے کچھ افسانے بھی ملتے ہیں۔ ان کی تخلیقات میں نسوانی شعور کی اولین بیداری اور ان کی خانگی، سماجی اور سیاسی مسائل سے ان کی آگہی کے نقوش نظر آجاتے ہیں''۔3

خون ارمان، خود صحرائی، نیرنگ زمانہ، حق بہ حق نذر سجاد حیدر کے چند معروف افسانے ہیں۔ ان کے نظریے کے مطابق بے راہ رو ہونے کے باوجود بھی عورت ایثار اور وفاداری سے بھری ہوئی ہوتی ہے۔ انھوں نے تحریک عدم تعاون Non Cooperation Movement پر بھی افسانے لکھے۔ جن پر 'عصمت' اور 'تہذیب' جیسے رسالوں میں بحث بھی چھیڑی گئی۔ یہاں تک کہ چند رجعت پسند حضرات نے لڑکیوں کی تعلیم اور اور ان کی آزادی خیال کے مسئلے کو بہت اُلجھا دیا۔ 1926 میں انھوں نے اخبار میں چھپی ہوئی ایک خبر پر اپنا افسانہ 'حور صحرائی' کا پلاٹ تعمیر کیا اور بڑے دلچسپ انداز میں بیان کیا کہ جنگل میں شیر کے کچھار میں دو انسانی بچے نکلتے ہیں جنھیں شیرنی اپنا دودھ پلاتی ہے۔

''در اصل نذر سجاد کا دور تعلیمی اور سماجی لحاظ سے بر صغیر کی عورتوں کے لیے بہت ہی کٹھن تھا اور انھوں اپنی تحریروں میں خاص کر افسانوں کے ذریعے عورتوں کے لیے کھلی فضا میں سانس لینے کے لیے راہ ہموار کی۔ ان کے افسانے 'نجمہ' میں مشرقی و مغربی اقدار کی کشمکش دکھائی گئی ہے۔''

مردوں کی کوششوں سے سب سے پہلے عباسی بیگم۔4 اور نذر سجاد حیدر نے اُردو میں افسانے لکھنے شروع کیے۔

1915 میں بیگم عباسی نے اپنا پہلا افسانہ 'گرفتار قفس' کے عنوان سے لکھا، جس کا موضوع 'پردہ' ہی تھا۔ یعنی وہ پردے کی اس قدر مخالف تھیں کہ انھوں نے پردہ نشین عورتوں کو پنجرے میں قیدی سے تشبیہ دے دی۔ عورتوں کے ساتھ ہو رہے مردوں کے ظلم کو 'ظلم بیکساں' نامی افسانے میں دکھایا۔ البتہ 'دو شہزادیاں' نام کے افسانے میں عشق کی داستان بیان کی۔ جس میں تاریخ کو مسخ کر کے اس

کا پلاٹ تعمیر کیا گیا۔ یعنی مغل شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر سے شکست کھا کر شہزادہ شجاع کی دو بیٹیاں جنگل میں ایک جھونپڑی میں رہنے لگیں۔ وہاں ایک نوجوان لڑکا ان کی مدد کرتا ہے اور اپنی ظریفانہ حرکتوں سے انکا غم دُور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس طرح دونوں شہزادیاں ان سے بے تکلف باتیں کرتی ہیں۔ کچھ مہینوں کے بعد اس علاقے کا نواب انھیں اپنے محل میں تشریف لانے کی دعوت دیتا ہے۔ جب وہ دونوں شہزادیاں وہاں سے رخصت ہونے کی تیاری کر رہی ہیں، تو چھوٹی شہزادی اس نوجوان کو اپنی انگوٹھی بطور یادگار تحفہ دے دیتی ہے۔ محل پہنچ کر ان شہزادیوں کا والہانہ استقبال کیا جاتا ہے۔ پھر انھیں اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جنگل میں ان کے ساتھ جو نوجوان رہتا تھا، وہ کوئی اور نہیں، بلکہ اصل میں وہی اس علاقہ کا نواب ہے، جس نے انھیں یہاں بلا لیا ہے۔

فنی اعتبار سے دیکھا جائے گا تو اس میں افسانے کے سبھی لوازمات کا خاص خیال رکھا گیا ہے۔ جیسے پلاٹ، کردار نگاری، خاص کر تجسّس اور رومان سے یہ افسانہ بھرا ہوا ہے۔5

مسز عبدالقادر (1898-1976) کے والد مولوی فقیر محمد عالم، فاضل تھے، جنھوں نے اپنی بیٹی زینب خاتون کی تعلیم و تربیت اپنے ہی گھر میں کی۔ بچپن سے ہی انھیں سیر و سیاحت کا شوق جنوں کی حد تک تھا۔ لڑکپن میں سوچنے کی عادت اس حد تک بڑھ گئی کہ وہ بیماری کی وجہ سے لاغر ہو گئیں۔ اور انھیں اس کا علاج کروانا پڑا۔ صرف ساڑھے تیرہ برس کی عمر میں ان کی شادی ایک پختہ عمر نوجوان میاں عبدالقادر (ریلوے انجینئر) سے کی گئی۔ سیر و سیاحت کا شوق بدستور قائم رہا اور پورے مشترکہ بھارت کے ساتھ ساتھ یورپ اور مشرق وسطیٰ کو بھی دیکھا۔ حج کا فریضہ بھی ادا کیا۔1919-20 میں ان کا پہلا افسانہ ''لاشوں کا شہر'' منظر عام پر آ گیا۔ اس کے بعد ان کے درج ذیل افسانوی مجموعے اور ناول بھی شائع ہوئے۔

1۔ لاشوں کا شہر اور دوسرے افسانے (1936)۔2۔ صدائے جرس (1939)۔3۔ راہبہ اور دوسرے افسانے (1946) وادی قاف اور دوسرے افسانے (1954) اور پانچواں ناول 'تخت باغ' ہے۔

مسز عبد القادر کا تخیل اپنے عروج پر تھا، لیکن سیاحت اور مطالعے و مشاہدہ کے پیش نظر انھوں نے اپنے بیشتر افسانوں میں ہیبت ناک ماحول کی زیادہ تر عکاسی کر لی جس میں 'بلائے ناگہاں' نام کا افسانہ اہم مانا جاتا ہے۔

''۔۔۔۔ جواں بخت نے اپنے تمام قبیلے کی دعوت کی، اور سب کے سامنے ایک نیم عریاں کاہن نے جواں بخت کی چھنگلیا سے چند قطرے خون نکال کر ایک طشتری میں ٹپکائے۔ پھر اپنی خاص زبان میں اس خون پر مجھ سے قسم لی گئی۔ جس کا مفہوم یہ تھا کہ اگر میری وجہ سے جواں بخت کو کسی قسم کی تکلیف پہنچے تو روحیں مجھے بھی وہی سزا دیں''۔6

موصوفہ اپنے دور کے مغربی اور مشرقی افسانہ نگاروں کے اثرات سے دور نہیں رہ سکیں۔ خاص کر رومانیت، پُر اسراریت، نفسیاتی، کیفیات، ہیبت ناک ماحول، دہشت ناکی، تحیّر خیزی ان میں بدرجہ اتم موجود ہے۔

اُمتہ الوحی نے 1916 کے بعد 'عصمت' اور 'تہذیب' جیسے رسالوں میں اپنے افسانے چھاپنے شروع کیے۔ 'شاہد وفا' ان کا ایک معروف افسانہ ہے، جو کہ سات دیگر افسانوں کے ساتھ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا۔ اب اگر یہاں 'شاہد وفا' پر ہی بات کریں تو یہ افسانہ دو حصّوں پر مشتمل ہے، جس کو الگ الگ بھی پڑھا جا سکتا ہے اور پہلا حصّہ دوسرے حصّہ کے لیے پس منظر کا کام دے سکتا ہے۔

جس میں سعید اور سلمہٰ کے خوشحال گھرانے میں ایک لڑکے کی پیدائش ہوتی ہے اور وہ لوگ اپنے بچے کی پرورش کے لیے مہر النساء کو آیا کے طور پر گھر میں رکھتے ہیں، جو کہ سلمہٰ پر اکثر یہ ظاہر کرتی رہتی ہے کہ ان کا تعلق بڑے گھرانے سے تھا، پھر ان پر کوئی آفت آ گئی، حالانکہ ان کا اصل مقصد ہوتا ہے سعید پر ڈورے ڈالنا۔ اس کے یہ تیور دیکھ کر سعید انھیں نوکری سے نکالنا چاہتا ہے، لیکن سلمہٰ ان کی عیاری کو نہیں سمجھ پاتی ہے اور وہ مہر النساء پر ترس کھا کر اپنے شوہر کو مناتی ہے اور دھیرے دھیرے حالت یہاں تک پہنچ جاتے

ہیں کہ وہ اپنے شوہر کا نکاح خود مہر النساء سے کرواتی ہے اور اب وہ اپنی عیاری سے اس قدر حالات پیدا کرتی ہے کہ سلمہٰ کو حاملہ ہونے کے باوجود ان کے میکے بھیجا جاتا ہے، جہاں وہ دوسرے بچے کو جنم دیتی ہے۔ اس کی بیماری میں سعید اس کی کوئی خبر نہیں لیتا ہے۔اسطرح اس افسانے کا پہلا حصّہ ختم ہو جاتا ہے اور دوسرے حصّے میں چونکہ سعید اور مہر النساء کو اولاد نہیں ہوتی ہے اور وہ سلمہ سے اس کا بچہ چھین کے لیتے ہیں۔ ادھر مہر النساء اکثر بیمار رہتی ہے اور سلمہٰ ان کے گھر میں روپ بدل کو نوکرانی کا کام کرتی ہے۔مہر النساء کے ٹھیک ہو جانے کے بعد اب سعید بیمار پڑ جاتا ہے اور انھیں خون کی ضرورت پڑ جاتی ہے، جسکا گروپ سلمہٰ سے ملتا ہے۔سلمہٰ اس کو خون دیتی ہے اور کمزوری کی وجہ سے وہ اللہ کو پیاری ہو جاتی ہے۔آخری وقت میں سعید کو اس بات کا پتہ چل جاتا ہے اور وہ اپنے کیے ہوئے پر سخت پشیمان ہو جاتا ہے۔

اس افسانے میں پیش کی گئی کہانی کو اگر چہ دو حصّوں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس کے دو الگ الگ مرکزی خیال بھی ہو سکتے ہیں، لیکن اس کی خوبی یہ ہے کہ اس میں وحدت تاثیر کبھی بھی کم نہیں ہوتا ہے۔افسانے میں مرکزی کردار یعنی سلمہٰ پر ہی زیادہ توجہ دے دی گئی ہے اس کے جذبۂ ایثار کو پیش کیا گیا ہے۔مصنفہ نے ایک وسیع تر موضوع کو ہاتھ میں لے لیا ہے، لیکن واقعات کی ترتیب کی وجہ سے افسانے میں قاری کی دلچسپی ہمیشہ برقرار رہتی ہے۔مصنفہ کے خیال میں اس لیے ندرت پائی جاتی ہے کیونکہ عام طور پر اس قسم کے موضوعات کو چھیڑتے ہوئے سوتن بدلہ یا گھریلو وسماجی جھگڑے پیش کرنے کی توقع ہوتی ہے، لیکن یہاں ہماری سوچ کے برعکس نتائج سامنے آجاتے ہیں، کیونکہ مصنفہ نے عام سوچ سے ہٹ کر کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔7

خاتون اکرم غالباً اُردو کی پہلی افسانہ نگار ہیں کہ جن کے افسانوں کا مجموعہ 'گلستان خاتون' شائع ہوا۔ اس میں مختصر افسانوں کے ساتھ ساتھ ان کے طویل افسانے بھی شامل تھے، جن میں ان کے دو طویل افسانے 'پیکر وفا' اور 'بچھڑی بیٹی' الگ الگ کتابچّوں کی صورت میں بھی چھپ گئے۔ خاتون اکرم کا صرف چوبیس برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ خاتون پر راشد الخیری کا واضح اثر ہمیں ملتا ہے۔ خاص کر ان کے افسانے 'بالائی آمدنی' کو ہی دیکھ لیجیے، جہاں کردار اپنے بُرے افعال کے بعد خواب دیکھتا ہے اور پھر خوف کے مارے تائب ہو جاتا ہے۔

خاتون اکرم کا ایک افسانہ 'آرزو پر قربان' بظاہر لگتا ہے کہ حقیقت سے بعید ہے، لیکن کبھی کبھار کچھ لوگ ایسے ضدی بھی ہوتے ہیں کہ جو دکھاوے کے لیے اپنی جان یا مال کا نقصان کرتے ہیں۔ اسی طرح اس افسانے میں ایک ضدی عورت اپنی تین سالہ بیٹی کو اس لیے روزہ رکھوا دیتی تا کہ وہ اپنے گھر میں افطاری کی تقریب منعقد کر سکے۔ جون کے مہینے میں ماہ رمضان ہے۔سخت گرمیوں کے پیش نظر ان کی نند اور بہن انھیں ایسا کرنے کے لیے منع کرتے ہیں، لیکن وہ کسی کی بھی نہیں سنتی ہے اور اس طرح ان کے گھر میں مہمان آنے شروع ہوتے ہیں۔ افطاری کے وقت وہ ننّھی ثریا کو ڈھونڈتے ہیں، جو کہ ایک کمرے میں سخت پیاس کی وجہ سے مردہ پڑی ہے، اس نے اپنی ماں کے خوف کی وجہ سے صراحی سے ایک بوند پانی نہیں سے پیا تھا۔8

ہم جس ابتدائی دور کی بات کر رہے ہیں اس میں زبیدہ زری نامی خاتون کا نام بھی ڈھونڈنے سے مل جاتا ہے، جن کے افسانوں کا مجموعہ '' ادب زری'' کے عنوان شائع ہوا تھا، ان کے بیشتر افسانوں میں راشد الخیری اور پریم چند کے اثرات نمایاں طور پر نظر آجاتے ہیں۔

راحت آرا بیگم کے افسانوی مجموعوں میں پریمی، بانسری کی آواز کے علاوہ اور بھی کچھ مجموعوں کا پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے معاشرتی اور رومانوی موضوعات پر افسانے لکھے، جس سے لگتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے بہت سے افسانہ نگاروں کا رنگ پکڑا کر اپنے انداز سے پیش کیا۔

''اس مقالے میں جہاں بانو (1907 پیدائش) کا ذکر کرنا اس لیے لازم ہے کیونکہ انھوں نے حیدر آباد میں افسانے

لکھنے کی پہلی کوشش کی۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ سے ایم اے کیا اور پھر زنانہ کالج میں اُردو پروفیسر ہوئیں۔ کئی کتابوں کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں کا مجموعہ رفتار خیال کے عنوان سے شائع ہوا۔''9

آمنہ نازلی کا بھی مختصر افسانہ میں ایک اہم نام ہے، انھوں نے چند سطروں میں افسانے لکھ کر پردے کے پیچھے چھپے ہوئے ناسوروں کو بے نقاب کیا۔

حمیدہ سلطان (1914) نے بھی دلی میں کئی یادگار افسانے لکھے۔

خیر ان ابتدائی خواتین افسانہ نگاروں کے بارے میں پروفیسر قمر رئیس کی رائے بھی قابل غور ہے۔

''1918ء - 1930ء سے مختصر افسانے کی مقبولیت کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ اگر چہ اس کے پہلے بھی مختصر افسانے لکھے جاتے تھے۔ عصمت اور تہذیب کے پرانے پرچوں میں خواتین کے قلم سے لکھے ہوئے افسانے کافی تعداد میں ملتے ہیں۔ ان کے لکھنے والیوں میں سے کسی کو کوئی خاص شہرت نصیب نہیں ہوئی اور ان میں سے بعض نے ایک یا دو افسانے لکھ کر پھر اور کچھ نہیں لکھا''۔10

حجاب امتیاز علی (1908-1999) کوئی غیر معروف افسانہ نگار نہیں ہیں، البتہ ان کی کوششوں کو یہاں اس لیے سراہا جاتا ہے، کیونکہ ان تک آتے آتے اُردو سماج میں عورتوں کا لکھنا پڑھنا اور پردے سے باہر آنا عام ہوا تھا۔ یعنی ایک جمود توڑ دیا گیا۔ جس کے بادل برسوں تک خواتین پر منڈلا رہے تھے۔ حجاب نے ہی اس کی شہ رگ توڑ دی۔ حجاب کے والد سید محمد اسماعیل نظام دکن کے فرسٹ سکریٹری اور ان کی والدہ عباسی بیگم قلم کار تھیں۔ اس لیے ان کی تعلیم و تربیت اس قدر ہوئی کہ انھیں برصغیر کی پہلی ہوا باز خاتون ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ ان کی شادی سید امتیاز علی تاج (مصنف ڈراما انار کلی) سے ہوئی، جس کے والد سید ممتاز علی سر سیّد کے دوست، صحافی اور ناشر بھی تھے۔ خاص کر وہ تعلیم نسواں کے زبردست حامی تھے۔

جس کی وجہ سے 'تہذیب نسواں' کی ادارت حجاب کے ہاتھوں میں آ گئی۔

خیر یہاں ان کے افسانوی مجموں پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔

''بے شک ان پر داستانوں کا بظاہر ہمیں کوئی اثر نہیں ملتا ہے، لیکن ان کے کردار گوشت پوست اور اس دنیا کے جیتے جاگتے انسان ہونے کے با وجود بھی اس دنیا سے پرے نظر آجاتے ہیں۔ اسی طرح وہ اپنے افسانوں میں یہیں کے مکانات باغات لہلہاتے کھیت کھلیاں، پرندوں کی چہچہاہٹ، دھوپ چھاؤں اور ہواؤں کو ہی پیش کرتی ہیں، لیکن ایسی کیفیت ان کے ہاں پائی جاتی ہے کہ ہم کسی اور دنیا میں اپنے آپ کومحسوس کرتے ہیں۔''

1۔ میری نا تمام محبت اور دوسرے رومانی افسانے (1932) 2۔ لاش اور دوسرے ہیبت ناک افسانے 1933ء 3۔ کاؤنٹ الیاس کی موت 1935ء 4۔ تحفے اور دوسرے شگفتہ افسانے 1939 5۔صنوبر کے سائے اور دوسرے رومانی افسانے 1939ء 6۔ ممی خانہ اور دوسرے ہیبت ناک افسانے 1935ء۔ 7۔ ڈاکٹر گار کے افسانے۔ 8۔ احتیاط عشق ان کے افسانوں کے بارے میں ڈاکٹر مسعود رضا خاکی نے کیا خوب لکھا ہے:

''ان کے افسانے حسن و لطافت، شعر و نغمہ، رومان و رنگین سے معمور ایک ایسی فضا پیش کرتے ہیں، جس میں محو ہو کر قاری دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا ہے''۔11

اب حجاب کے کرداروں یا ان کی منظر نگاری کی بات ہم کریں گے۔ بے شک ان پر داستانوں کا بظاہر ہمیں کوئی اثر نہیں ملتا ہے، لیکن ان کے کردار گوشت پوست اور اس دنیا کے جیتے جاگتے انسان ہونے کے با وجود بھی اس دنیا سے پرے نظر آجاتے ہیں۔ اسی طرح وہ

اپنے افسانوں میں یہیں کے مکانات باغات لہلہاتے کھیت کھلیاں، پرندوں کی چہچہاہٹ، دھوپ چھاؤں اور ہواؤں کو ہی پیش کرتی ہیں ،لیکن ایسی کیفیت ان کے ہاں پائی جاتی ہے کہ ہم کسی اور دنیا میں اپنے آپ کو محسوس کرتے ہیں۔

آج جہاں اُردو میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ صنف افسانہ میں بھی بہت ساری خواتیں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں اور اُردو میں تانیثی لٹریچر کے تحت مشتاق احمد وانی، شہناز نبی ،صالحہ صدیقی وغیرہ نے اچھّا خاصا تنقیدی و تحقیقی کام بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر مسعود رضا خاکی نے 'تہذیب' کے قدیم شماروں سے جن خواتین افسانوں کو دریافت کیا ان میں ریل کا سفر 1915 (انجمن آرا) شش و پنج (1915) تیسری تاریخ کا چاند (1918)، سعیدہ کا کوکب 1919، مشق ستم 1920، سالگرہ 1918، ندامت 1924، مرتا کیا کرتا 1925، عجلت بیچارہ 1925 (آصف جہاں) وغیرہ خاص اہم ہیں۔

یہ 1920 کے آس پاس کا دور تھا، جب اُردو کی خواتیں افسانہ نگاروں پر راشد الخیری کا زبردست اثر رہا۔ جن میں بغدادی بیگم اور تاج النساء کا نام سرفہرست ہے، البتہ تاج النساء کے ہاں ہمیں راشد الخیری (افسانہ روزہ) پریم چند (ایضائے وعدہ) اور حسن نظامی (غدر) تینوں کا اثر غالب نظر آرہا ہے۔12

آج جہاں اُردو میں دیگر اصناف کے ساتھ ساتھ صنف افسانہ میں بھی بہت ساری خواتیں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہیں اور اُردو میں تانیثی لٹریچر کے تحت مشتاق احمد وانی، شہناز نبی ،صالحہ صدیقی وغیرہ نے اچھّا خاصا تنقیدی و تحقیقی کام بھی کیا ہے۔ڈاکٹر مشتاق صدفؔ (اُردو کی خواتین فکشن نگار ساہتہ اکادمی 2014) پروفیسر صغرا مہدی اور میسرہ اختر نے خواتین لٹریچر پر کیے گئے مقالات کو ترتیب دے کر کتابی صورت میں ناقدین و محققین کو سہولیت بہم پہنچائی، لیکن ہماری ابتدائی خواتین افسانہ نگاروں پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

حوالے وحواشی

1 بحوالہ - راشد الخیری فکر وفن - ڈاکٹر محمد اکبر۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی 2015 -صفحہ 13 - (اصل ہفتہ وار ہماری زبان انجمن ترقی اُردو ہند دہلی فروری 1975)

2 نذر سجاد حیدر یلدرم کے بارے میں کچھ معلومات انٹرنیٹ پر بھی دستیابی۔ accessingmuslimlives.orgZ

3 نسائی افسانے کی نئی قرأت۔ میسّرہ اختر - ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی 2024۔ صفحہ 30۔

4 عباسی بیگم حجاب امتیاز علی کی والدہ تھیں۔ افسانوں کے علاوہ ان کا ناول ''زہرا بیگم'' اور فلسفیانہ مضامین کا مجموعہ ''گل صحرا'' بھی یادگار ہے۔

5 عباسی بیگم کے افسانوں کی جانکاری اس کتاب سے لے لی گئی۔ اُردو افسانے کا ارتقاء ڈاکٹر مسعود خاکی۔ مکتبہ خیال لاہور۔ 1987 صفحہ 253۔

6 اُردو افسانے کا انسائیکلو پیڈیا

7 اُردو افسانے کی روایت 1903 - 2009۔ مرزا حامد بیگ - عالمی میڈیا دہلی۔ فروری 2014 -صفحہ 395

8 اُردو افسانے کا ارتقاء ڈاکٹر مسعود خاکی - مکتبہ خیال لاہور - 1987۔ صفحہ 355۔

9 دکن میں اُردو-نصیر الدین ہاشمی-NCPUL صفحہ 816

10 اُردو ادب میں دہلی کی خواتین کا حصّہ۔ مرتبہ پروفیسر صغرا مہدی۔ اُردو اکادمی دہلی 2006 صفحہ 161۔

11 اُردو افسانے کا ارتقا - ڈاکٹر مسعود خاکی مکتبہ خیال لاہور۔ 1987۔ صفحہ 260۔

12 اس مقالے کی تیاری کے دوران محولہ بالا کتاب سے کافی استفادہ کیا گیا جسکی فوٹو کاپی ہمارے ذاتی کتب خانے میں موجود ہے ضخامت 494 صفحات۔

❐❖❐

Dr. Gulshan Abdullah
Darualadab, Farashgund
Budgam, Kashmir-191111 (J & K)

کچھ پوچھنے سے ڈرتی تھی۔ ایک ماں ہو کر اپنی بیٹی سے سوال کرنے سے کیوں ڈرتی تھی، یہ میں خود بھی سمجھ نہیں سکی۔ ہماری ماں نے تو ہم کو ڈرا کر رکھا تھا اور میں اپنی بیٹی سے سوال کرنے سے ڈرتی تھی۔

میری یہ خواہش تھی کہ میری بیٹی پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے تاکہ میرے بعد اسے کسی کے سہارے کی ضرورت نہ پڑے، نہ ہی وہ کبھی کسی کی محتاج ہو۔ ذہین تو وہ شروع سے ہی تھی۔ اس کی محنت رنگ لائی اور سوفٹ ویئر انجینئرنگ پوری کرتے ہی اُسے ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ اس کی پُراعتماد شخصیت سے لوگ متاثر ہوئے بنا نہ رہتے۔

میری زندگی کا ایک مقصد پورا ہو گیا تھا اب میں چاہتی تھی کہ اس کے ہاتھ پیلے کر کے اپنا یہ فرض بھی پورا کر دوں۔ مگر میں جب بھی اس سے اس بارے میں بات کرتی تو وہ 'ابھی نہیں' کہہ کر ٹال دیتی۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ نئی نسل ذمے داریوں سے بھاگتی ہے کسی بندھن میں بندھنا انہیں پسند نہیں مگر میں خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میری فکر کا دامن بھی وسیع ہو رہا تھا۔

''میری زندگی کا ایک مقصد پورا ہو گیا تھا اب میں چاہتی تھی کہ اس کے ہاتھ پیلے کر کے اپنا یہ فرض بھی پورا کر دوں۔ مگر میں جب بھی اس سے اس بارے میں بات کرتی تو وہ 'ابھی نہیں' کہہ کر ٹال دیتی۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ نئی نسل ذمے داریوں سے بھاگتی ہے کسی بندھن میں بندھنا انہیں پسند نہیں مگر میں خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی''

کام کے سلسلے میں اب وہ شہر سے باہر ٹور پر بھی جانے لگی تھی۔ کئی بار وہ رات دیر سے پارٹیوں سے لوٹی۔ اس کا اس طرح گھر سے باہر رہنا مجھے پریشان کرتا۔ جب تک وہ لوٹ کر نہ آتی میں سو نہ پاتی۔ میرا دل طرح طرح کے وسوسوں سے گھرا رہتا۔ جوان جہان لڑکی اکیلے گھر سے باہر رہے تو ماں کو نیند آ بھی کیسے سکتی ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں یہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح شراب تو نہیں پینے لگی ہے؟ اب ہمارے زمانے والے حالات تو رہے نہیں نئی نسل پوری طرح سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ چکی ہے۔ لڑکیاں اب لڑکوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگی ہیں اور اسی ریس میں سگریٹ کے دھویں بڑی شان سے ہواؤں میں اُڑاتی نظر آتی ہیں۔ اب تو متوسط طبقے کی خواتین بھی کسی تقریب میں مردوں کے ساتھ جام سے جام ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ ہاتھ میں گلاس لیے اس انداز سے گھومتی ہے کہ اللہ معاف کرے۔ لگتا ہے زمانہ بہت آگے نکل گیا اور ہم زمانے سے پچھڑ گئے۔ یہ لوگ جسے آزادی کہتے ہیں ہم آج بھی اُسے بے حیائی کہتے ہیں اور یہی لوگ مجھ جیسے لوگوں کو دقیانوسی اور رجعت پسند کہتے ہیں۔

ایک روز میں نے کاجل کو پکڑ کر بٹھا لیا۔

''اب کئی سال ہو گئے تمھیں اور ویحان کو ایک ساتھ گھومتے پھرتے۔ اب تو تمھیں شادی کر لینی چاہیے۔''

''آپ کی ہر بات شادی پر آ کر کیوں ختم ہوتی ہے؟ شادی کے علاوہ بھی زندگی میں بہت کچھ ہے۔''

''کیا تمھیں شادی نہیں کرنی؟ عمر کیسی تیزی سے نکل رہی ہے احساس ہے تم کو اس بات کا؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''کم آن ماں۔ اب یہ فضول باتیں پھر سے شروع نہ کر دینا۔ ابھی زندگی اِنجوائے کرنے دو۔''

''شادی کے بعد بھی زندگی اِنجوائے ہو سکتی ہے۔ عمر نکل گئی تو بڑی مشکل ہو گی؟''

''کیا مشکل ہو گی؟ بتائیے مجھے؟''

''زیادہ عمر ہو جائے تو بچے کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔'' میں نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''کس زمانے میں جی رہی ہیں آپ ماں۔ ٹیکنالوجی نے بڑی ترقی کر لی۔ بہت سے نئے راستے نکل آئے ہیں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ چل کریے۔''

''کیسے بے فکر ہو جاؤں؟ اگر کل کو مجھے کچھ ہو گیا تو بھری دنیا میں اکیلی رہ جاؤ گی۔ تمھارا اپنا گھر پریوار ہو گا تو مجھے بھی تسلی رہے گی۔ چین سے مر تو سکوں گی؟''

تمام عمر روایت اور جھوٹی شان و شوکت کو زندہ رکھنے میں گنوادی، جس کا انھیں ذرا بھی غم نہ تھا۔ پٹھان سرائے کے باہر کی دنیا کو انھوں نے کبھی جھانک کر بھی دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ طوائفوں کے ناز ونخرے کی محفل سجانا ہو یا مشاعروں کی داد بٹورنے کے لے بڑے شاعروں کو دور دور سے بلوانا اور پھر ان محفلوں کی چمک دمک وشور سے اپنے نام کا ڈھنڈورا پٹوا کر اپنی تعریفیں سننا مظہر علی خاں کا محبوب مشغلہ ہے۔ ان کی کوٹھی میں مہمانوں کی ہمیشہ بھیڑ لگی ہوتی جن کی خوب خاطر تواضع کی جاتی ہے۔

اطہر، مظہر علی خاں کا اکلوتا فرزند ہے جسے اس دنیا میں لاتے ہوئے مظہر علی خاں کی اہلیہ چل بسیں، اطہر کی پرورش شہزادوں کی طرح ہوئی۔ اطہر خوب رو ہونے کے ساتھ ساتھ ذہین، باذوق اور ایک شاعر بھی ہے۔ کتابوں سے دوستی اس نے کم عمری میں ہی کر لی تھی۔ وہ اپنے طرز پرورش و عادات کے سبب بے حد نازک مزاج اور تنہائی پسند ہوگیا۔ اطہر کی نازک مزاجی کا علم اس کے والد مظہر علی خاں کو تب ہوا جب وہ نوری کے عشق میں مبتلا ہو کر طوائفوں کی گلیوں میں اکثر دکھائی دینے لگا۔ اس پر عشق کا جنون اس حد تک غالب ہونے لگا کہ وہ نوری کو حاصل کرنے کے لئے آگ کے دریا کو بھی عبور کرنے پر راضی ہو جاتا۔ پہلے تو بیٹے کے عشق کے چرچوں کو مظہر علی خاں زمینداروں کے شوق کا حصہ بتاتے ہوئے نظر انداز کرتے رہے۔ لیکن جب اطہر کا جذبہ عشق اپنی حدود کو پار کرنے لگا تو مظہر علی خاں نے اس عشق کی آگ کو اپنے جوتے تلے روند دیا۔ اطہر اس صدمے سے بے ہوش ہوگیا، ایک دن اور ایک رات کے بعد آخر کار ڈاکٹر اسے ہوش میں لانے میں کامیاب ہوئے۔ لیکن اطہر کی حالت اب اس ناکامیاب عاشق کی طرح ہوچکی تھی جس میں زندگی کی رمق ذرا بھی باقی نہ رہی ہو۔ اطہر کی ذات میں نوری کی جدائی ایسا خلا کر گئی کہ جس کی تلافی اب کسی صورت ممکن نہیں تھی۔ وہ زندگی کو جینے کی جگہ گزارنے لگا۔ اطہر جو کہ پہلے سے ہی شاعر تھا، غمِ یار کی آنچ لگی تو اس کے اندر کا فنکار کندن کی طرح اور بھی زیادہ چمکنے لگا۔ وہ اب مشاعروں کی جان بن گیا، اس کے ہر شعر پر واہ! واہ!

کی برسات ہونے لگتی کیونکہ آہ کا نشتر تو اندھیرے میں بھی نشانے پر ہی لگتا ہے۔ اطہر نے اپنا تخلص یاس رکھا۔ والد نے اطہر کو وکالت پڑھانے کی خواہش ظاہر کی لیکن وہ شاید اس بات سے انجان تھے کہ عشق کا مارا ہوا زندگی کی ہر جنگ میں ناکام ہی ہوتا ہے۔

مظہر علی خاں کو اپنے بیٹے کے لیے دلہن تلاش کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی، اطہر اور رضیہ رشتہ ازدواج سے منسلک ہوگئے۔ رضیہ، علی دراز خاں کی بیٹی ہے جو اپنے گھر میں بڑے نازوں سے پلی ہے۔ رضیہ اپنے مچلتے امنگوں سے بھرے ارمانوں سمیت خوب ٹھاٹھ باٹھ سے سسرال لائی گئی۔ یہ مظہر علی خاں کا حکم تھا کہ ان کی بہو کے قدم زمیں پر نہ پڑے اور خادمہ ہر وقت رقیہ کی خدمت میں حاضر رہے۔ رقیہ جب اطہر کے قریب ہوئی تو اسے جلد ہی احساس ہوگیا کہ اطہر کے وجود میں ایک ادھورا پن ہے۔ جسے دور کرنے کی کوشش کرتے کرتے وہ اپنے آپ کو بھول گئی۔ دولت کچھ کم ہوئی تو بہو رانی کے قدم زمیں سے آپ ہی لگ گئے اب وہ گھر کے کام بھی کرنے لگی۔ رقیہ اطہر کی زندگی میں نہ جانے کس کی کمی کو پورا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ کیا وہ اطہر کی زندگی میں ماں اور ماں کی محبت کی محرومی کو دور کر رہی تھی؟ یا پھر اطہر کی زندگی میں عشق کے ان جذبوں کو جلانے کی کوشش کر رہی تھی جو نوری کے بعد برسوں سے ٹھنڈے پڑے تھے؟ اس نے کبھی کوئی سوال خود سے نہ کیا اور نہ ہی اطہر سے کبھی کوئی جواب مانگا۔ دن یوں ہی گزرنے لگے اور اطہر جو اپنی ذاتی پیچیدگیوں میں الجھا تھا اسے فرصت ہی نہ ہوئی کہ وہ کبھی رقیہ کے دل پر نقش درد کے تمام داستان پڑھ پاتا۔

مظہر علی خاں اپنے بلاوے پر کچھ وقت بعد اس دنیا سے چلے گئے اور وراثت میں دولت نہ سہی لیکن زمیندارانہ طرز ضرور چھوڑ گئے تھے۔ یہاں کی رونق پہلے کی طرح ہی برقرار رہی بلکہ اطہر کی شاعری نے بیٹھک میں لگنے والی محفل کو اور بھی جاندار بنا دیا۔ یہاں ہمیشہ لوگوں کا جماوڑا رہتا، زنان خانے سے پکوان طشتریوں میں آتے رہتے کہ شان و شوکت میں کسی طرح کی کمی نہ آنے پائے اور اس طرح فرضی شان کو قائم رکھنے کی کوشش میں قرض بڑھتا ہی چلا گیا۔

اطہر کے دو بیٹے اصغر اور اکبر ہوئے۔ ان کی پرورش بھی شہزادوں کی طرح ہی ہونے لگی۔ اسکول جانے کی جگہ بچوں کو استاد گھر پر ہی پڑھانے آیا کرتے تھے۔ اطہر نے استاد کو بچوں پر کسی قسم کی سختی نہ کرنے کی ہدایت خاص طور پر دی تھی۔ اصغر اور اکبر کے بعد اطہر کی ایک بیٹی بھی ہوئی جس کا نام اس نے نوری رکھا۔ نوری اطہر کی لاڈلی تھی اور اس کا یوں چاہے جانا اصغر اور اکبر کو ذرا بھی نہ بھاتا تھا۔ قسمت اطہر پر مہربان بھی ہوئی تو بڑے مختصر وقفے کے لیے پھر یوں ہوا کہ نوری کی لاعلاج بیماری اسے اپنے ساتھ لے گئی اور ایک بار پھر تقدیر نے اطہر کو اندھیرے کنویں میں دھکیل دیا۔ رات میں اطہر کی شاعری پر واہ واہی کی برسات ہوتی اور اگلی صبح جیب خالی ہوتی تو وہ قرض داروں کے دروازے پر چلا جایا کرتا تھا۔ رضیہ جس کے اٹھنے بیٹھنے کا انتظام کرنے کے لئے بھی کبھی نوکر ہوا کرتے تھے۔ دھیرے دھیرے وہ بھی نہ رہیں، اب گھر کا کونا کونا رضیہ خود اپنے ہاتھوں سے صاف کرتی، کھانا پکانے سے لے کر رچھوٹے موٹے میلے کچیلے کام بھی اب وہی کیا کرتی تھی۔

اصغر اور اکبر جوان ہوگئے لیکن گھر کی مالی حالت نہ بدلی بلکہ اب تو کوئی قرض دینے کو بھی تیار نہ ہوتا تھا۔ اطہر کے لڑکے بڑے ہوکر بدتمیز ہوگئے۔ وہ ہمیشہ اپنے باپ سے زبان درازی کرتے اور دکاندار و قرض وصول کرنے والے جب دروازے پر آکر اپنے پیسوں کا مطالبہ کرتے تو اصغر ان سے بھڑ جاتا کئی بار ان سے ہاتھا پائی بھی ہو جاتی اور وہ اپنے باپ دادا کو بے ایمان اور بے غیرت بنا کے چلا آتا تھا۔ تیس سال بعد رضیہ بھی تھک گئی تو اس نے ایک نامعلوم بیماری کو خود میں پناہ دے دی۔ پہلے تو قرض پر ڈاکٹروں نے اس بیماری کی دوا خوب تلاش کی لیکن جب قرضداروں کے دروازے بھی بند ہوگئے تو اللہ کا در کھل گیا۔ روحانی دواؤں سے علاج جاری رہا، پھر یوں ہوا کہ رضیہ جو برسوں سے تھکی تھی موت کی نیند سوگئی۔ رضیہ کی موت پر کسی کو غم نہ ہوا آخر کرتے بھی کیوں زندگی نے ایسی کون سی خوشی دی تھی جسے چھوڑ جانے پر غم کیا جاسکتا تھا۔ اطہر کا رہا سہا آخری سہارا بھی چھن گیا۔ رضیہ کو خاک میں لٹا کر اطہر کی بھی اٹھنے کی چاہت نہ ہوئی وہ بھی شدید بیمار رہنے لگا۔ بیٹوں کو باپ سے کچھ خاص قربت نہیں تھی۔ اطہر کے آخری وقت میں رامیا ہی خیراتی ہسپتال سے دو گھنٹے قطار میں لگ کے دوا لا کر دیتا ہے لیکن اطہر میں کسی طرح کی کوئی بہتری نہیں آتی اور اس طرح وہ اپنے انجام کو پہنچ جاتا ہے۔ اس کی موت کے بعد اصغر آوارہ گردی کرتے ہوئے گھر کا راستہ بھول جاتا ہے اور اکبر تنہا رہ جاتا ہے۔ وہ گھر جو روٹیوں کو اچھال کر فقیروں کا تماشہ دیکھا کرتا تھا، وقت نے اسی گھر کے فرد کو اس بھکاری کی جگہ پر لا کھڑا کیا جہاں ایک ایک نوالے کے لیے ترسنا ان کے مقدر کا حصہ بن گیا۔

جس عہد میں جیلانی بانو کی تشریف آوری اس شہر میں ہوئی وہ دور یہاں کی پرانی قدروں کی تخریب کا دور تھا۔ یہاں ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی جارہی تھی۔ ہر طرف انتشار کا ماحول تھا۔ شہر حیدرآباد زمانہ قدیم سے ہی ایک تہذیب کا اہم مرکز رہا ہے۔ یہاں کے بڑے بڑے زمینداروں نے اپنی اونچی شان و شوکت سے اس تہذیب کی آبیاری کی لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کا سورج غروب ہونے لگا اور ان کی عزت کوڑیوں کی بھی نہ رہ گئی، انھیں پوچھنے والے نہ رہے، زمانہ ایک قدم روشنی کی جانب بڑھ گیا اور یہ اندھیروں میں اپنے اجداد سے ملی روایات کو سنبھالتے رہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں سے ملی وراثت کو قابلِ فخر مانا اور زمانے سے لاعلم رہیں۔ اس زمانے میں مرد و عورت کا باہم مل جل کر رہنے کا رواج نہ تھا بلکہ پردے کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔ جیلانی بانو کے قصوں کی اکثر فضا اور محور یہی زمانہ ہے۔ جہاں مرد عیاشیوں میں چور اور وقت سے غافل تھا۔ دوسری طرف زنان خانے میں عورت جانوروں سے بدتر زندگی گزرانے پر مجبور تھی۔ بچوں کی پرورش، امور خانہ داری کی ذمہ داری اور اپنے مجازی خدا کا حکم ماننا، یہی ان عورتوں کی زندگی کا مرکز تھا۔ ناولٹ 'دیکھیں کیا گزرے ہے قطرے پہ' سے ایک مختصر اقتباس دیکھیں؛

> ''گھر کی عورتیں ساسوں، جٹھانیوں اور بڑی بھاوجوں کے سامنے گھونگھٹ کاڑھ کے آتی تھیں خواہ ان کے آگے بھی گھونگھٹ والی دلہنیں آجائیں۔

یہاں ہر تیسری عورت دق میں مبتلا ہے اور ہر دوسری عورت ہسٹیریا کی مریض ہے۔ ویسے باقی سب عورتوں پر کسی نہ کسی کا سایہ ضرور ہوتا ہے، جس کی وجہ سے مقبروں اور مسجدوں میں بڑی رونق رہتی ہے۔''

(جیلانی بانو، ''کیا گزرے ہے قطرے پہ۔۔۔''، ص-14)

'دیکھیں کیا گزرے ہیں قطرے پہ' جیلانی بانو کا ایک بہترین ناولٹ ہے۔ جسے انھوں نے آزادی کے بعد کے پس منظر میں تیار کیا ہے۔ انھوں نے اس ناولٹ میں حیدرآباد کے سیاسی، سماجی اور مذہبی پس منظر کا خاکہ فنکاری سے کھینچا ہے۔ جیلانی بانو نے ان علاقوں کی حالت اور یہاں کے لوگوں کی ذہنیت کو صفحہ قرطاس پر بڑی ہی سچائی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ان باشندوں کو دنیا اور سماج میں ہونے والی کسی تبدیلی سے کوئی غرض نہ تھا، انھیں اپنی دنیا عزیز تھی۔ انھوں نے اپنی جھوٹی جاہ وحشم کو زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی، انھیں یقین تھا کہ گئے دن ضرور لوٹ کر آئیں گے لیکن وقت کی روانی ہمیشہ دریا کی طرح ایک ہی سمت ہوتی ہے اور یہ روانی کبھی مخالف سمت نہیں مڑتی ہے۔ جیلانی بانو خاص کر اس دور کی عورت سے ہمدردی رکھتی ہیں، جو قید و بند میں اپنی زندگی گزارنے پر مجبور تھی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں عورت کو مرکزی حیثیت دے کر ان کے ناسور زخموں پر مرہم رکھنے کی کوشش کی ہے۔ وہ اس بات سے بھی اچھی طرح واقف ہیں کہ اس کائنات کے تمام رنگ جو زندگی کی علامت ہیں وہ زن کے وجود سے ہی قائم و دائم ہیں اور اگر یہ عورتیں پستی کے دلدل سے نہ نکالی جائیں تو یہ معاشرہ بربادیوں کی نذر ہو جائے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب جب کوئی نظام عیش پرستی کا عادی ہوا ہے، اس نے مختلف قسم کی برائیوں کو خود میں پناہ دی اور زمانے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی جگہ آرام پسند ہوئے تو اسے تاج وتخت سے محروم کر دیا گیا۔ کچھ ایسا ہی جاگیردارانہ نظام کے ساتھ بھی ہوا۔

جیلانی بانو ایک باصلاحیت اور بے باک فکشن نگار ہیں۔ وہ معاشرے کی ہر کروٹ پر غائر نگاہ رکھتی ہیں۔ لفظوں کی بازی گری کا فن بھی انھیں خوب آتا ہے۔ وہ کبھی الفاظ میں رس گھول کر اپنی سحر بیانی سے مسحور کرتی ہیں تو کبھی انھیں ہتھیار بنا کر طنز کے تیر چلاتی ہیں جو دل میں پیوست ہو کر لہولہان کرنے میں ہمیشہ کامیاب ہوتے ہیں۔ لفظوں کو احساس کی چاشنی میں ڈبو کر وہ کردار کے ہر کرب کو قاری پر منتقل کر دیتی ہیں جسے پڑھنے والا ذاتی طور پر محسوس کرتا ہے۔ کسی بھی فنکار کے یہاں اس کے عہد کا گہرا عکس موجود ہوتا ہے جس کا نشان فنکار کے فن پر بڑی آسانی سے دیکھا جاسکتا ہے۔ جیلانی بانو کی تحریروں میں بھی یہ بات بڑی آسانی سے دیکھی جاسکتی ہے۔ ہم قدیم حیدرآباد کی فضا کو اس کی ہر رمق کے ساتھ مکمل طور پر ان کی تصانیف میں دیکھ اور محسوس کر سکتے ہیں۔ انسانی احساسات کا تجزیہ کرنے کا انداز ان کا اچھوتا اور نرالا ہے۔ عام طور پر کسی قصے میں ہم دیکھتے ہیں کہ مرکزی کردار کو کلیدی حیثیت حاصل ہوتی ہے اور قصے میں اس کردار کے متعلق چھوٹی سے چھوٹی باتوں کا بھی خوب خیال رکھا جاتا ہے، دوسری طرف دیگر ضمنی کرداروں کی باریکی میں اتنا خاص خیال نہیں رکھا جاتا ہے ایک دو چھوٹی موٹی چیزیں چھوٹ بھی جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ لیکن جب ہم ایک نظر جیلانی بانو کے کرداروں پر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ وہ اپنے تمام کرداروں کے جزئیات کو بڑی سلیقہ مندی کے ساتھ کہانی میں جگہ دیتی ہیں۔ وہ اس بات کا خاص خیال رکھتی ہیں کہ کرداروں کے خدوخال کا جائزہ ہر زاویے سے لیا جائے کہیں کوئی گوشہ باقی نہ رہ جائے۔ ان کے یہاں سماجی نابرابری، رشتوں کی ٹوٹتی ہوئی تصویر، تنہائی، طاقت ور کا کمزوروں پر ظلم وستم، زندگی کی تلخی، سماجی بیڑیوں میں بندھے انسانی جذبات، انسانیت، نفسیات، سیاستدانوں کی چال بازیاں، دولت مند لوگوں کی بے حسی، صنفِ نازک کی سماجی حیثیت، زبر کا زور وغیرہ جیسے مسائل موجود ہیں۔ جیلانی بانو اپنے بے مثال کارناموں کے سبب بہت سے اعزازات سے بھی نوازی جا چکی ہیں۔

❐❖❐

Saiqa Gayas
Add : MR / 49 Masjid mohallah Benachity
Durgapur -13 , Post : Benachity
Dist :Paschim Burdwan-713213(West Bengal)
E-mail: saiqagayas308@gmail.com

جمیلہ خاتون

ماحولیات کے تحفظ میں خواتین کا کردار

تمہید: ماحولیات عصرِ حاضر کا ایک اہم اور حساس مسئلہ ہے۔ صنعتی ترقی، شہری توسیع، جنگلات کی کٹائی، آلودگی اور موسمیاتی تبدیلی نے انسانی زندگی کو شدید خطرات سے دوچار کر دیا ہے۔ ایسے حالات میں ماحولیات کے تحفظ کی ذمہ داری صرف حکومتوں یا اداروں تک محدود نہیں بلکہ سماج کے ہر فرد پر عائد ہوتی ہے۔ اس تناظر میں خواتین کا کردار غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ خواتین نہ صرف فطرت سے قریب تر زندگی گزارتی ہیں بلکہ سماجی، گھریلو اور معاشی سطح پر وسائل کے استعمال کی بنیادی ذمہ دار بھی ہوتی ہیں۔

خواتین اور فطرت کا باہمی تعلق:

تاریخی اور تہذیبی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ خواتین کا رشتہ فطرت سے قدیم اور فطری ہے۔ زرخیزی، پرورش اور نگہداشت جیسے اوصاف عورت کی شخصیت کا حصہ ہیں جو فطرت کی بقا سے ہم آہنگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مختلف معاشروں میں زمین، ماں اور فطرت کے تصورات کو باہم جوڑا گیا ہے۔ خواتین فطرت کو محض ایک وسیلہ نہیں بلکہ زندگی کا سرچشمہ سمجھتی ہیں۔

گھریلو سطح پر خواتین کا ماحولیاتی کردار:

گھر معاشرے کی بنیادی اکائی ہے اور خواتین اس کی مرکزی منتظم ہوتی ہیں۔ گھریلو سطح پر ماحول دوست رویوں کے فروغ میں خواتین کا کردار بنیادی حیثیت رکھتا ہے: پانی، بجلی اور ایندھن کے محتاط استعمال سے وسائل کا تحفظ، خوراک کے ضیاع سے بچاؤ، پلاسٹک کے کم استعمال اور متبادل اشیا کی حوصلہ افزائی، گھریلو صفائی اور صحت مند ماحول کی تشکیل، یہ تمام اقدامات ماحولیاتی تحفظ کی عملی صورتیں ہیں جو خواتین روزمرہ زندگی میں انجام دیتی ہیں۔ خواتین گھریلو زندگی کی منتظم ہوتی ہیں۔ پانی، خوراک، ایندھن اور توانائی کے درست استعمال میں ان کا کردار ماحول دوست عادات کو فروغ دیتا ہے۔ پانی کے ضیاع سے بچاؤ، خوراک کا ذمہ دارانہ استعمال، پلاسٹک کے کم استعمال کی ترغیب۔

دیہی زندگی، زراعت اور خواتین:

دیہی معاشروں میں خواتین کا انحصار براہِ راست قدرتی وسائل پر ہوتا ہے۔ وہ کھیتی باڑی، بیجوں کے تحفظ، پانی کے حصول، ایندھن کی فراہمی اور مویشی پروری میں فعال کردار ادا کرتی ہیں۔ نامیاتی اور قدرتی زراعت کا فروغ، مقامی بیجوں کی حفاظت، زمین، مٹی اور پانی کی پائیدار دیکھ بھال، یہ تمام عوامل ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے میں مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں خواتین کھیتی باڑی، بیجوں کے تحفظ، فصلوں کی دیکھ بھال اور مویشی پروری میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ یہ تمام سرگرمیاں قدرتی وسائل کے پائیدار استعمال سے جڑی ہوئی ہیں۔ نامیاتی زراعت کا فروغ، مقامی بیجوں کا تحفظ، زمین اور مٹی کی زرخیزی کا خیال۔

خواتین اور ماحولیاتی تعلیم:

خواتین بطور ماں اور معلم آنے والی نسلوں کی فکری و اخلاقی تربیت کرتی ہیں۔ بچوں میں ماحول سے محبت، صفائی کی عادت، درخت لگانے کا شوق اور قدرتی وسائل کے احترام کا جذبہ پیدا کرنا

دراصل مستقبل کی ماحولیاتی حفاظت کی ضمانت ہے۔ ماحولیاتی تعلیم کا آغاز گھر سے ہوتا ہے اور اس میں خواتین کا کردار فیصلہ کن ہے۔خواتین کی قیادت اور ماحولیاتی تحریکیں، دنیا بھر میں خواتین نے ماحولیاتی تحریکوں کی قیادت کی ہے۔ جنگلات کے تحفظ کے لیے عوامی تحریکیں، آلودگی اور صنعتی استحصال کے خلاف احتجاج، پائیدار ترقی اور سبز معیشت کے منصوبے، ان تحریکوں نے یہ ثابت کیا کہ خواتین نہ صرف ماحولیاتی مسائل کو سمجھتی ہیں بلکہ ان کے حل کے لیے عملی جدوجہد بھی کرتی ہیں۔

ماحولیاتی بحرانوں کا سب سے گہرا اثر خواتین پر پڑتا ہے۔ پانی کی قلت، خوراک کی کمی، موسمیاتی تبدیلی اور قدرتی آفات خواتین کی روزمرہ زندگی کو شدید متاثر کرتی ہیں۔ اسی لیے خواتین ماحولیاتی انصاف کی تحریک میں پیش پیش رہتی ہیں اور مساوی وسائل کی تقسیم کا مطالبہ کرتی ہیں۔

ترقی پذیر ممالک میں خواتین محدود وسائل کے باوجود ماحولیات کے تحفظ میں اہم خدمات انجام دیتی ہیں۔ اگر انہیں تعلیم، تربیت اور فیصلہ سازی میں شامل کیا جائے تو وہ ماحولیاتی پالیسیوں کو زیادہ مؤثر اور پائیدار بنا سکتی ہیں۔

تحقیقی مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ جہاں خواتین کو بااختیار بنایا گیا، وہاں ماحولیاتی تحفظ کے نتائج زیادہ مثبت رہے۔ خواتین کی شرکت کے بغیر ماحولیاتی منصوبے ادھورے اور غیر موثر ثابت ہوتے ہیں۔

یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ خواتین ماحولیات کی خاموش مگر مضبوط محافظ ہیں۔ وہ فطرت کے ساتھ ہم آہنگ زندگی گزار کر تحفظِ ماحول کی عملی مثال پیش کرتی ہیں۔ اگر خواتین کو تعلیم، وسائل اور قیادت کے مواقع فراہم کیے جائیں تو ماحولیاتی بحران پر قابو پانا ممکن ہے۔ ماحولیات کا تحفظ دراصل انسانی بقا کا تحفظ ہے اور اس جدوجہد میں خواتین کا کردار کلیدی، ناگزیر اور دیرپا ہے۔

ہندوستانی خواتین صدیوں سے مقامی ماحولیاتی علم (Indigenous Environmental Knowledge) کی محافظ رہی ہیں۔ دیہی اور قبائلی خواتین کو موسموں، مٹی کی نوعیت، بیجوں کی اقسام، پودوں کی دواؤں اور پانی کے ذرائع کا گہرا علم ہوتا ہے۔ یہ علم جدید سائنسی تحقیق کے لیے بھی نہایت قیمتی ہے۔

مثال کے طور پر: قبائلی خواتین جنگلاتی پودوں سے ادویات تیار کرتی ہیں۔ کسان خواتین فصلوں کی گردش (Crop Rotation) کے ذریعے زمین کی زرخیزی برقرار رکھتی ہیں یہ تمام طریقے ماحولیاتی توازن کے ضامن ہیں۔

ماحولیاتی تحریکوں میں اجتماعی نسوانی کردار:

ہندوستان میں ماحولیات کے تحفظ کی کئی تحریکیں ایسی ہیں جن کی بنیاد اور قوت خواتین کی اجتماعی جدوجہد رہی ہے۔ چپکو تحریک میں خواتین نے درختوں سے لپٹ کر جنگلات کو کٹنے سے بچایا۔ نرمدا بچاؤ آندولن میں خواتین نے صرف ماحول نہیں بلکہ انسانی وقار اور سماجی انصاف کا مقدمہ بھی لڑا۔ یہ تحریکیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ خواتین کی شمولیت ماحولیات کو ایک اخلاقی اور انسانی مسئلہ بنا دیتی ہے، ہم ذیل میں چند خواتین کا تذکرہ کر رہے ہیں جنھوں نے ماحولیات کے تحفظ کے لیے اپنی خدمات انجام دیں ہیں۔

.1وندنا شیوا(Vandana Shiva):

میدانِ کار: ماحولیاتی فلسفہ، زرعی تحفظ، حیاتیاتی تنوع

خدمات: وندنا شیوا ہندوستان کی عالمی شہرت یافتہ ماہرِ ماحولیات ہیں۔ انھوں نے نامیاتی زراعت کے فروغ، مقامی بیجوں کے تحفظ، جینیاتی طور پر تبدیل شدہ فصلوں (GMO) کے خلاف جدوجہد، میں نمایاں کردار ادا کیا۔ انھوں نے Navdanya تحریک کے ذریعے کسانوں اور فطرت کے حقوق کی آواز بلند کی۔

.2 میدھا پاٹکر(Medha Patkar)

میدانِ کار: ماحولیاتی انصاف، انسانی حقوق

خدمات: میدھا پاٹکر نرمدا بچاؤ آندولن کی روحِ رواں رہیں۔ بڑے ڈیم منصوبوں سے متاثرہ ماحول، بے گھر ہونے والے قبائلی اور دیہی باشندوں، کے حقوق کے لیے آواز اٹھائی۔ ان کی جدوجہد نے ترقی اور ماحولیات کے توازن پر قومی بحث کو جنم دیا۔

3. گورادیوی (Gaura Devi)

میدانِ کار: جنگلات کا تحفظ

خدمات: گورادیوی چپکوتحریک کی اہم رہنما تھیں۔ درختوں کی کٹائی کے خلاف، خواتین کومتحرک کر کے انھوں نے جنگلات کے تحفظ میں تاریخی کردارادا کیا۔ یہ تحریک عالمی سطح پر ماحولیاتی مزاحمت کی علامت بن گئی۔

4. سنیتا نارائن (Sunita Narain)

میدانِ کار: ماحولیاتی پالیسی، آلودگی

خدمات: سنیتا نارائن Centre for Science and Environment (CSE) کی ڈائریکٹر جنرل ہیں۔ فضائی آلودگی، آبی وسائل، موسمیاتی تبدیلی پر تحقیقی رپورٹیں اور پالیسی تجاویز پیش کیں۔ انھوں نے ماحولیات کو عوامی اور حکومتی ایجنڈے کا حصہ بنایا۔

5. راجندر کور (Rajinder Kaur): (قبائلی سطح کی کارکن)

میدانِ کار: مقامی سطح پر آبی تحفظ،

خدمات: انھوں نے بارش کے پانی کے ذخیرے، کنوؤں کی بحالی، جنگلاتی تحفظ کے لیے مقامی خواتین کو منظّم کیا اور دیہی ماحولیاتی شعور بیدار کیا۔

6. انومیتارائے چودھری (Anumita Roychowdhury)

میدانِ کار: شہری ماحولیات

خدمات: انھوں نے گاڑیوں سے ہونے والی آلودگی، صاف ایندھن کی پالیسی، شہری فضائی معیار پر تحقیقی اور عملی اقدامات کیے اور ماحول دوست شہری منصوبہ بندی کو فروغ دیا۔

7. تلسی گوڑا (Tulsi Gowda)

میدانِ کار: شجرکاری اور جنگلات

خدمات: تلسی گوڑا کو 'درختوں کی ماں' کہا جاتا ہے۔ 30 ہزار سے زائد درخت لگائے، مقامی جنگلاتی علم کو محفوظ کیا، فطرت کے ساتھ ہم آہنگ زندگی کی مثال قائم کی ان کی خدمات کو قومی سطح پر سراہا گیا۔

8. ارمیلا بھٹاچاریہ (Urmila Bhattacharyya)

میدانِ کار: ساحلی ماحولیات

خدمات: انھوں نے ساحلی علاقوں میں مینگروز کے تحفظ، ماہی گیروں میں ماحولیاتی شعور کے لیے کام کیا اور سمندری ماحول کے تحفظ میں اہم کردارادا کیا۔

ماحولیاتی انصاف اور نسوانی نقطۂ نظر:

ماحولیاتی انصاف (Environmental Justice) کے تصور میں خواتین کا نقطۂ نظر نہایت اہم ہے۔ خواتین ماحول کو استحصال کی چیز نہیں بلکہ زندگی کے نظام کے طور پر دیکھتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ نسوانی ماحولیاتی فکر (Ecofeminism) ہندوستان میں ایک مضبوط نظریاتی دھارا بنتی جا رہی ہے، جو فطرت اور عورت دونوں کے استحصال کے خلاف آواز بلند کرتی ہے۔

ماحصل:

ہندوستانی خواتین نے ثابت کیا ہے کہ ماحولیات کا تحفظ صرف ایک سائنسی یا حکومتی مسئلہ نہیں بلکہ ایک سماجی، اخلاقی اور ثقافتی ذمہ داری ہے۔ ان کی جدوجہد خاموش مگر گہری، مقامی مگر عالمی، اور روایتی مگر جدید تقاضوں سے ہم آہنگ ہے۔ اگر مستقبل میں ماحول کو محفوظ بنانا ہے تو خواتین کے کردار کو مرکزی حیثیت دینا ناگزیر ہوگا۔ ان خواتین کی خدمات اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ ماحولیات کا تحفظ صرف سائنسی یا حکومتی مسئلہ نہیں بلکہ سماجی اور اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ ہندوستانی خواتین نے جنگلات، پانی، زمین، فضا اور حیاتیاتی تنوع کے تحفظ میں قائدانہ کردارادا کر کے دنیا کے لیے ایک مثال قائم کی ہے۔

❑❖❑

Jameela Khatoon
Research Scholar
RTM Nagpur University Nagpur
H.No.W/260A Near Sufi Nagar Masjid
Bhoiline
Kalamna Road
KAMPTEE.441001(M/S)
Mobile No. 8055195885
Email.jk08june@gmail.com

نورینہ پروین

وہ بال برابر کا فرق

وہ بال برابر کا فرق ہے/ جس نے آدم کو باعثِ فخر
ابلیس کو متکبر کر دیا

اسے زعم تھا کہ 'وہ سب سے بہتر ہے'
بس یہی وہمِ باطل تھا
جس نے جھکنے دیا نہ سر کو
تھا وہ بھی مقربوں میں/ اک 'انا' نے کر دیا پامال
ایک ہی پل میں/ مقامِ خاص گیا،/ عزت بھی گئی،
تمام اپنے بھی پرائے ہوئے!
اک وہ تھا/ جو منتخب ہوا
تو مسجودِ ملائک ٹھہرا
اسمِ علَم سیکھا
مقامِ بلند پایا
اور پھر محو ہوا نظام کی تابانی میں!
آج پھر
وہی سرگزشتِ آدم ہے
جو خود کی رہبری کرے
یا پھر
رب کی تابع داری!!

Dr. Nurina Parveen
Village & Post- Kasenda
Block- Chail
District- Kaushambi- 212202 (UP)

سیدہ ایمن عبدالستار

اللہ حافظ امی جان...!!

ان کی لوری کو/ ان کی تھپکی کو
اس پیارے مقدس آنچل کو
اللہ حافظ...!!!
ممتا کی ٹھنڈی چھاؤں کو/ دعاؤں کے حصار کو
محبت کے اس گھنے بادل کو/ اللہ حافظ..!!!
ان نرم ہاتھوں کے احساس کو/ میری زندگی کی آخری آس کو
ساتھ گزرے زندگی کے لمحات کو/ اللہ حافظ...!!!
گھر اب فقط خالی مکان رہ گیا
نہ سر پہ اب وہ شفقت کا آسمان رہ گیا
ان رونقوں کو،/ ان خوشیوں کو،/ ان خوش گپیوں کو،/ اللہ حافظ...!!!
ان سنہرے لمحوں کو،/ ان یادوں کو
ان خوبصورت اور قیمتی ساعتوں کو
ان ہنستے بستے زمانوں کو/ ان محبت بھرے فسانوں کو
اللہ حافظ...!!!!
جدائی کے آخری پلوں کو/ وہ تیرے ٹھنڈے ہاتھوں
کو ان روشن ستارہ آنکھوں کو/ اللہ حافظ...!!!
ماں کی اس جاویدانی ہستی کو/ ان کے مقدس سراپے کو
ان کی عظمت کو آخری سلام
اللہ حافظ امی جان...!!!

❐❖❐

Syeda Aiman Abdus Sattar
Al-Hayat Apartments
Flat No.1,Riyaz Colony
Take Nagar, Amba Jogai Road
Latur-413531(M.S)
sayyedaaayeman@gmail.com

گردشِ ایّام

رینو بہل

کاجل کے پرس میں اپنی لِپ اِسٹک تلاش کرتے اچانک میرے ہاتھ میں ایک پیکٹ آ گیا جس کا لیبل پڑھ کر مجھے اپنے پیروں تلے کی زمین کھسکتی محسوس ہوئی۔ چہرے کا رنگ اُڑ گیا اور ہاتھ کانپنے لگے۔ حیرت سے آنکھیں پھیل گئیں اور پیشانی پر بَل پڑ گئے۔ اس سے پہلے کہ میں کچھ بولنے کے قابل ہوتی، کاجل نے میرے ہاتھ سے وہ پیکٹ چھین لیا اور پرس اٹھا کر بجلی کی رفتار سے گھر سے باہر نکل گئی۔ نہ جانے کتنی دیر میں حیرت کی مورت بنی ساکت کھڑی رہی۔ پھر لڑکھڑاتے ہوئے قریب ہی پڑی آرام کرسی پر ڈھیر ہوگئی۔

کاجل میرا کُل سرمایہ، میرے جینے کا واحد سہارا اور میری اکلوتی اولاد ہے۔ مایوسی اور فکر کے گہرے سمندر میں خود کو ڈوبتے محسوس کر رہی ہوں۔ زندگی کا رُخ اتنی جلدی کیسے پلٹ گیا؟ وقت نے کیسی کروٹ لی ہے کہ سب کچھ ہاتھوں سے پھسلتا محسوس ہو رہا ہے۔ کچھ عرصہ پہلے تو سب ٹھیک چل رہا تھا۔ ہم دونوں کے درمیان کوئی فاصلہ نہ تھا۔ میری اَن کہی بات بھی وہ سمجھ جاتی تھی۔ ہم دونوں کے علاوہ گھر میں کوئی تیسرا تھا بھی نہیں۔ ابھی تو اس نے اپنی توتلی زبان سے ماں بابا کہنا شروع ہی کیا تھا۔ جب اچانک دل کا دورا پڑنے سے اس کے باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اس نے تو اپنے باپ کو صرف تصویر میں ہی دیکھا تھا۔ بھری جوانی میں بیوہ ہونے کا غم زندگی بھر کے روگ کی طرح مجھ سے چسپاں ہو گیا تھا مگر گود میں معصوم سی پری نے جینے کا مقصد دے دیا تھا۔ اس کا میری زندگی میں آنا کسی وَردان سے کم نہ تھا۔ اسے دیکھ کر میں جیتی، اپنا ہر غم، ہر محرومی بھول جاتی۔ زمانے کے سرد گرم موسم سے اُسے بچانا چاہتی۔ مادہ پرندے کی طرح اسے اپنے پروں میں چھپا کر رکھنا چاہتی۔

ہمدردانہ بنیاد پر ہی شوہر کے دفتر میں مجھے ملازمت مل گئی تو زندگی کی گاڑی دھیرے دھیرے رینگنے کے قابل ہوگئی۔ سسرال والوں نے تو چھ مہینے بعد ہی ہر ذمہ داری سے پلّہ جھاڑ دیا تھا اور لاتعلقی کا سلوک اختیار کر لیا تھا۔ اس وقت میرے مائیکے والے اور خاص طور سے میری ماں مضبوط ڈھال بن کر میرے ساتھ کھڑی تھی۔ نوکری پر جانے لگی تو کاجل کو ماں کے پاس ہی چھوڑ کر جاتی۔ ایک تو عمر اور دوسرے جوان بیٹی کی بیوگی کے دُکھ نے ماں کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ ہر گزرتے دن کے ساتھ ان کی صحت گرتی گئی۔ کاجل اسکول جانے لگی تو میں نے ماں کو اس کی ذمہ داری سے آزاد کر دیا۔ پہلے وہ اسکول سے سیدھے کریچ جاتی تھی پھر جیسے جیسے وہ بڑی ہونے لگی، اس نے گھر میں اکیلے رہنا سیکھ لیا۔ میرے دفتر سے لوٹنے سے پہلے وہ اپنا اسکول کا کام ختم کر لیتی اور میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود گھر کے کاموں میں میرا ہاتھ بٹانے لگتی۔ ایک پل کے لیے بھی خاموش نہ رہتی۔ سارا دن کی روداد مجھے سناتی۔ کبھی کبھی تو مجھے ٹوکنا پڑتا کہ بس اب کچھ پل کے لیے خاموش ہو جا۔ مگر وہ کہاں خاموش رہنے والی تھی۔ جب تک اپنی بات مکمل نہ کر لیتی تب

تک چپ نہ ہوتی۔ میرے چہرے پر اداسی کی چھوٹی سی لکیر دیکھ کر پریشان ہو جاتی۔ میری آنکھ سے ٹپکا ایک آنسو دیکھ کر وہ زار و قطار رونے لگتی۔ میری کوشش ہوتی کہ میں اپنے دکھ، اپنی تکلیف کی اسے بھنک تک نہ پڑنے دوں۔

پھر جیسے جیسے بچپن کی دہلیز پار کر کاجل جوانی کی سیڑھیاں چڑھنے لگی، اس کے مزاج میں ہلکی ہلکی تبدیلی بھی مجھے نظر آنے لگی۔ جسم کے ساتھ زینت میں تبدیلی آنا قدرتی عمل ہے۔ چھوٹی چھوٹی تبدیلیاں گزرتے وقت کے ساتھ قبولیت حاصل کر لیتی ہیں۔ مسئلہ تو تب کھڑا ہوتا ہے جب اچانک کوئی بڑی تبدیلی رونما ہو۔

کالج میں نیا ماحول ملا، نئے دوست ملے۔ گھر کے پنجرے سے نکل کر کھلا آسمان ملا۔ رنگ برنگے لوگ ملے۔ نئے خواب آنکھوں میں بسنے لگے جس کو اس نے مجھ سے چھپانا سیکھ لیا تھا۔ میرے لاکھ پوچھنے پر بھی روز مرہ کے معمول کے علاوہ کوئی خاص بات نہ ہوتی۔ اب میری اُس کے دل اور اُس کے خیالات تک رسائی مشکل ہو گئی تھی۔ خاموشی سے اس کے بدلتے رنگ دیکھنے کے علاوہ میرے پاس کوئی راستہ نہ تھا۔

میری ماں بہت سخت مزاج تھی۔ ہم بہن بھائیوں پر اس کی ہر دم کڑی نظر رہتی۔ ہماری مجال ہی نہ تھی کہ ہم ان سے کوئی مذاق یا فضول بات کر سکتے۔ ماں کی تلخ زبان اور بابا کی قہر آلود گھورتی نگاہ ہی ہم بچوں کو دم سادھ کر بیٹھنے کے لیے کافی تھی۔ اپنے کمرے میں ان کی نظروں سے دور ہم بہن بھائی مل کر خوب مستی کرتے۔ ایک دوسرے سے اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتے۔ مگر کاجل تو میری اکلوتی اولاد تھی۔ نہ بہن نہ بھائی اور نہ ہی سر پر باپ کا سایہ۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اس کی پرورش میں روایتی ماں بن کر نہیں کروں گی بلکہ اس کی بہن، اس کی دوست بن کر اس کا ساتھ دوں گی۔ ہم دونوں کا رشتہ ایسا ہوگا کہ ہم بے جھجک ایک دوسرے سے ہر بات کر سکیں اور ہمارا رشتہ تھا بھی اسی طرح کا۔

پھر نہ جانے کب اور کیسے دھیرے دھیرے ہمارے رشتے میں فاصلہ آنا شروع ہو گیا؟ شاید اس کی جوانی نے میرے اندر کی ماں کو جگا دیا تھا۔ شوخ، الہڑ، خوبصورت، بِنا باپ کی جوان بیٹی کو بہکنے سے بچانے کے لیے، دنیا کی حقیقت سے اسے آگاہ کرنے کے لیے اس کی رہنمائی کرنا میرا فرض بھی تھا اور حق بھی۔ یہی بات ہم دونوں کے رشتے میں حائل ہو گئی۔ اسے ماں کا یہ نیا کردار پسند نہیں آیا۔ میں جانتی تھی اس کو میری نصیحتیں ناگوار گزرتی ہیں مگر میں اُسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھانے سے گریز نہ کرتی۔ مجھے یاد ہے جب پہلی بار میں نے گھر کی دہلیز پار کر مردوں کی دنیا میں قدم رکھا تھا تو وہ وقت میرے لیے کتنا اذیت ناک تھا۔ اکیلی عورت کو یہ مرد لنگر کا مال سمجھ کر اپنا حق جتانا چاہتے تھے۔ اپنی عزت اور وقار کو قائم رکھنے کے لیے مجھے کتنی جدوجہد کرنی پڑی تھی یہ میں ہی جانتی ہوں۔ میں چاہتی تھی میری بیٹی بھی عزت سے سر اُٹھا کر جیے اور میرے تجربوں سے فیض حاصل کرے۔

کالج کے شروع دنوں سے ہی اس کی دوستی ویحان سے تھی۔ اس نے اپنے گروپ کے باقی دوستوں سے جب ملایا تھا تو اس سے بھی یہ کہہ کر ملایا تھا کہ یہ میرا سب سے اچھا دوست ہے۔ اس وقت اس کی آنکھوں کی چمک اور لبوں پر پھیلی پراسرار مسکراہٹ کچھ اور ہی کہہ رہی تھی جب میں نے اکیلے میں اس سے پوچھا کہ:

''وہ صرف بیسٹ فرینڈ ہے یا اس سے بڑھ کر؟''

''ابھی تو صرف بیسٹ فرینڈ ہے، کل کا کچھ کہہ نہیں سکتے۔''

''اس کا خاندان کیسا ہے؟ گھر میں کون کون ہے؟''

''خاندان کہاں سے آ گیا؟ مجھے کیا پتا اس کے گھر میں کون کون ہے؟ میں نے کبھی پوچھا نہیں۔'' اس نے جھنجھلا کر جواب دیا۔

''میں تو بس یوں ہی پوچھ رہی تھی۔'' میں نے جھینپ کر کہا۔

''آپ لوگوں کا بس یہی مسئلہ ہے۔ نہ جانے کیا کیا سوچنے لگتے ہیں۔'' ناگواری سے مجھے دیکھتے ہوئے وہ اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔

میں اپنی بے وقوفی پر شرمندہ ہو کر رہ گئی۔

کاجل نے کبھی اپنی زبان سے اعتراف نہیں کیا مگر میں جان گئی تھی کہ وہ دونوں بے حد قریب ہیں۔ میں اُس سے اس بارے میں

کچھ پوچھنے سے ڈرتی تھی۔ ایک ماں ہو کر اپنی بیٹی سے سوال کرنے سے کیوں ڈرتی تھی، یہ میں خود بھی سمجھ نہیں سکی۔ ہماری ماں نے تو ہم کو ڈرا کر رکھا تھا اور میں اپنی بیٹی سے سوال کرنے سے ڈرتی تھی۔

میری یہ خواہش تھی کہ میری بیٹی پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے تاکہ میرے بعد اسے کسی کے سہارے کی ضرورت نہ پڑے، نہ ہی وہ کبھی کسی کی محتاج ہو۔ ذہین تو وہ شروع سے ہی تھی۔ اس کی محنت رنگ لائی اور سوفٹ ویئر انجینئرنگ پوری کرتے ہی اُسے ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھی ملازمت بھی مل گئی۔ اس کی پُراعتماد شخصیت سے لوگ متاثر ہوئے بنا نہ رہتے۔

میری زندگی کا ایک مقصد پورا ہو گیا تھا اب میں چاہتی تھی کہ اس کے ہاتھ پیلے کر کے اپنا یہ فرض بھی پورا کر دوں۔ مگر میں جب بھی اس سے اس بارے میں بات کرتی تو وہ 'ابھی نہیں' کہہ کر ٹال دیتی۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ نئی نسل ذمہ داریوں سے بھاگتی ہے کسی بندھن میں بندھنا انہیں پسند نہیں مگر میں خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا میری فکر کا دامن بھی وسیع ہو رہا تھا۔

میری زندگی کا ایک مقصد پورا ہو گیا تھا اب میں چاہتی تھی کہ اس کے ہاتھ پیلے کر کے اپنا یہ فرض بھی پورا کر دوں۔ مگر میں جب بھی اس سے اس بارے میں بات کرتی تو وہ 'ابھی نہیں' کہہ کر ٹال دیتی۔ یہ تو میں جانتی تھی کہ نئی نسل ذمہ داریوں سے بھاگتی ہے کسی بندھن میں بندھنا انہیں پسند نہیں مگر میں خاموش نہیں بیٹھ سکتی تھی۔

کام کے سلسلے میں اب وہ شہر سے باہر ٹور پر بھی جانے لگی تھی۔ کئی بار وہ رات دیر سے پارٹیوں سے لوٹی۔ اس کا اس طرح گھر سے باہر رہنا مجھے پریشان کرتا۔ جب تک وہ لوٹ کر نہ آتی میں سو نہ پاتی۔ میرا دل طرح طرح کے وسوسوں سے گھرا رہتا۔ جوان جہان لڑکی اکیلے گھر سے باہر رہے تو ماں کو نیند آ بھی کیسے سکتی ہے؟ اس کے علاوہ مجھے ہمیشہ کھٹکا لگا رہتا کہ کہیں یہ بھی دوسری لڑکیوں کی طرح شراب تو نہیں پینے لگی ہے؟ اب ہمارے زمانے والے حالات تو رہے نہیں نئی نسل پوری طرح سے مغربی تہذیب کے رنگ میں رنگ چکی ہے۔ لڑکیاں اب لڑکوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر چلنے لگی ہیں اور اسی ریس میں سگریٹ کے دھویں بڑی شان سے ہواؤں میں اُڑاتی نظر آتی ہیں۔ اب تو متوسط طبقے کی خواتین بھی کسی تقریب میں مردوں کے ساتھ جام سے جام ٹکراتی نظر آتی ہیں۔ ہاتھ میں گلاس لیے اس انداز سے گھومتی ہے کہ اللہ معاف کرے۔ لگتا ہے زمانہ بہت آگے نکل گیا اور ہم زمانے سے پچھڑ گئے۔ یہ لوگ جسے آزادی کہتے ہیں ہم آج بھی اُسے بے حیائی کہتے ہیں اور یہی لوگ مجھ جیسے لوگوں کو دقیانوسی اور رجعت پسند کہتے ہیں۔

ایک روز میں نے کاجل کو پکڑ کر بٹھا لیا۔

''اب کئی سال ہو گئے تمھیں اور ویجان کو ایک ساتھ گھومتے پھرتے۔ اب تو تمھیں شادی کر لینی چاہیے۔''

'' آپ کی ہر بات شادی پر آ کر کیوں ختم ہوتی ہے؟ شادی کے علاوہ بھی زندگی میں بہت کچھ ہے۔''

''کیا تمھیں شادی نہیں کرنی؟ عمر کیسی تیزی سے نکل رہی ہے احساس ہے تم کو اس بات کا؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''کم آن ماں۔ اب یہ فضول باتیں پھر سے شروع نہ کر دینا۔ ابھی زندگی اِنجوائے کرنے دو۔''

''شادی کے بعد بھی زندگی اِنجوائے ہو سکتی ہے۔ عمر نکل گئی تو بڑی مشکل ہو گی؟''

''کیا مشکل ہو گی؟ بتائیے مجھے؟''

''زیادہ عمر ہو جائے تو بچے کا مسئلہ ہو جاتا ہے۔'' میں نے اُسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

''کس زمانے میں جی رہی ہیں آپ ماں۔ ٹیکنالوجی نے بڑی ترقی کر لی۔ بہت سے نئے راستے نکل آئے ہیں۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ چل کریے۔''

'' کیسے بے فکر ہو جاؤں؟ اگر کل کو مجھے کچھ ہو گیا تو بھری دنیا میں اکیلی رہ جاؤ گی۔ تمھارا اپنا گھر پریوار ہو گا تو مجھے بھی تسلی رہے گی۔ چین سے مر تو سکوں گی؟''

''سوری مام، فی الحال میرا کوئی ارادہ نہیں شادی کا۔ ابھی تو مجھے بہت آگے جانا ہے۔ شاید مجھے جلد ہی پرموشن مل جائے اور مجھے بنگلور جانا پڑے۔ وہاں بھی تو مجھے اکیلے ہی رہنا پڑے گا۔''

بنگلور کا نام سُن کر مجھے جھٹکا لگا۔ میری زبان سے ایک لفظ بھی اور نہ نکل سکا۔ یہ تو پہلے ہی اکیلے مجھے چھوڑ کر جانے کا ارادہ کر چکی ہے، اس سے میں کیا کہوں؟ اگر بنگلور تبادلہ ہو بھی رہا ہے تو یہ بھی کہہ سکتی تھی کہ ماں دفتر سے لمبی چھٹی لے کر میرے ساتھ چلنا ہے آپ کو۔ ہم لوگ اپنے زمانے میں ماں باپ کی اجازت کے بنا گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتے تھے اور اب وقت ایسا آ گیا ہے کہ اجازت تو بڑی دور کی بات ہے اب تو صرف اطلاع دی جاتی ہے۔ شروع شروع میں کاجل دوستوں کے ساتھ جب باہر گھومنے جاتی تھی تو اجازت لے کر جاتی تھی۔ پھر دھیرے دھیرے اس نے پوچھنا چھوڑ دیا اور صرف بتا کر ہی جاتی تھی کہ آنے میں دیر ہو جائے گی۔ مگر یہ تو شہر سے باہر جا کر دوسرے شہر میں رہنے کا مسئلہ ہے۔ جب پہلی بار اس نے بنا اجازت کے گھر سے باہر قدم رکھا تھا تو مجھے اُسی وقت اُسے ٹوک دینا چاہیے تھا۔ میں اُس وقت خاموش کیوں رہی، اُسے ڈانٹا کیوں نہیں؟ اِس کا جواب آج بھی میرے پاس نہیں۔ یہ خودسری، اس کی پراعتماد شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے۔

میرے لیے یہ بات ہضم کرنا مشکل ہو رہی ہے کہ پرائے شہر میں جوان جہان لڑکی اکیلے کیسے رہے گی۔ میں نے اپنی فکر کا اظہار کیا تو وہ ہنس کر کہنے لگی۔

''مام، زمانہ بدل گیا ہے۔ میں تو صرف دوسرے شہر جا رہی ہوں، لڑکیاں تو دوسرے ملکوں میں پڑھائی اور نوکری کے لیے اکیلے چلی جاتی ہیں۔ اپنی سوچ بدلے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے دس ایسی لڑکیوں کے نام بھی گنوا دیے۔ میں خاموش ہو کر رہ گئی۔ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔

اور اب اس نئے مسئلے نے تو مجھے جھنجھوڑ کر ہی رکھ دیا ہے۔ میرا جی تو چاہتا ہے زمین پھٹ جائے اور میں اس میں سما جاؤں۔

ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے؟ ایک جوان جہان کنواری بیٹی کے پرس میں وہ 'پیکٹ' دیکھ کر بھی زندہ ہوں۔ صدمہ اتنا گہرا ہے کہ لگتا ہے سوچنے سمجھنے کی قوت شل ہو چکی ہے۔ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ مجھ سے اُس کی پرورش میں کس جگہ غلطی ہو گئی۔ میں تو اسے پڑھا لکھا کر اپنے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتی تھی۔ جو وہ ہو بھی گئی مگر اس کے ساتھ یہ کیسے عذاب آ گئے؟ کیا میں نے اسے پڑھا لکھا کر خود اعتماد بنا کر غلطی کی؟ مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہا کہ کس طرح اس سے نظریں ملا کر بات کروں گی؟ اگر اس نے بے باکی سے کہہ دیا کہ

''ہاں میں حفاظت کے لیے اِسے ضرورت پڑنے پر استعمال کرتی ہوں۔'' تو میں جیتے جی مر نہ جاؤں گی؟ اس طرح کے جواب کی میں اس سے توقع کر سکتی ہوں؟ آج کی نسل کو کسی کا لحاظ تو ہے نہیں اور صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ یا پھر مجھے خاموش رہ کر سب کچھ نظر انداز کر کے بہتے پانی کے بہاؤ کے ساتھ بہہ جانا چاہیے؟ شاید زمانے کے بدلتے اقتدار اور رفتار کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے میں ناکام رہی ہوں میں۔ اسی لیے آج شرم، مایوسی اور ناکامی کی گہری کھائی میں خود کو اوندھے منہ پست گرا ہوا دیکھ رہی ہوں۔

آج سوچتی ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ مجھ سے بہتر تو میری اَن پڑھ ماں تھی جس کی آنکھ کے ایک اشارے پر ہم سب اُن کا حکم بجا لاتے تھے۔ کسی کی کیا مجال جو اُن کے سامنے منہ بھی کھول دے۔ اور ایک میں ہوں تعلیم یافتہ، برسرِ روزگار جو اپنی اکلوتی اولاد کو سنبھال نہ سکی۔ نئی نسل کے لیے جو آزادی ہے ہماری نظروں میں وہ آوارگی ہے اور آوارگی کا اس آزادی کا مستقبل کیا ہوگا؟ خدا جانے۔

آج کے بعد میں شاید فخر، عزت اور وقار کے ساتھ سر اُٹھا کر دنیا کا سامنا تو دور خود اپنا سامنا بھی نہ کر پاؤں۔ آج میں اپنی شکست، اپنی ناکامی تسلیم کرتی ہوں۔

❐❖❐

Renu Behl
#1505, Pushpa complex
Sector 49B,
Chandigarh-160047 (Haryana)
E-mail: renubehl06@gmail.com

افسانے

پچھتاوا

حکیم رئیس فاطمہ

کورونا کی وبا و بحران کی آمد اور اس کی بڑھتی طغیانی نے انقلاب برپا کر دیا۔۔۔دنیا میں عالمی وائرس کے پھیلاؤ ... قرنطینہ ... آکسیجن کی قلت ... صبر آزما کرونائی دور کے احساسات، جذبات و کیفیات ... پوری دنیا تشویش اور سراسیمگی کے ساتھ دیکھتی رہی کہ کورونا کا ایک عرصے سے جاری معاملہ 'کوارنٹائن کلچر' اور 'بربریت' کی ایک نئی شکل اختیار کر گیا ... وبا کا سامنا کرنے کے لیے نت نئے تخلیقی، نرالے اور متاثر کن طریقے استعمال کیے گئے ... یقین نہیں آتا کہ ہوا کیا ... ساری دنیا ہی بدل گئی ... زندگی کے رنگ ڈھنگ بدل گئے ... دوریاں نزدیکیوں میں اور نزدیکیاں دوریوں میں بدل گئیں ... رشتوں کا زوال ... لیکن کئی چہروں کے مکھوٹے بھی اتر گئے- ہر طرف درد و الم، بے حسی اور افراتفری کا عالم ہے- روز و شب دنیا بھر کی خبروں سے براہ راست آگہی- ہلاکتوں کی خبروں نے دہلا دیا ... پہلے لوگ اپنے گھر، رشتے ناطے، احوال خاندان اور دوست احباب سے متعلق امور پر بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے- لیکن اب محاسبہ کرنے لگے ہیں ... وہ بھی اپنے آپ کا ... وبا کا خوف اور بچنے کے احتیاط میں شدت کتنی بڑھی ... ڈاکٹروں کی من مانی .... مریضوں کی آنکھ، دل، گردے وغیرہ کی تجارت .... اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ایسے اندوہ ناک و بھیانک ماحول میں بھی لوگ مفاد پرست ہونے لگے تھے۔ پرائے تو پرائے اپنے بھی! چھوٹے سے وائرس نے پوری دنیا کو ہلا کے رکھ دیا تھا ...!!

حامد! تم آخر کیا سوچ رہے ہو؟ یہی نا ... کہ کیوں نہ میں نے اچھی تربیت کی ہوتی ... اپنی غلطی اور اپنے فیصلے پر افسوس ... ندامت ... پھر ... سوچ ... پچھتاوا ... اور پھر غلطی کا احساس اور فکر کھائے جا رہی ہے نا .... کف افسوس ملنے سے بھلا اب کیا فائدہ.؟ زوبی کی تربیت میں نے اس طرح نہ کی ہوتی تو شاید مجھے آج یہ دن نہیں دیکھنا پڑتا ....!! اب پچھتانے سے کیا فائدہ ...؟ جب چڑیاں چگ گئیں کھیت ... حامد کی آنکھوں سے اشکوں کا دریا ابل پڑا ....!!

حامد کو کسی کے بلانے کی آواز آئی۔ اس نے چونک کر مڑ کے دیکھا! کوئی نہیں تھا بس سسکیوں کی صدائیں اور مسلسل کسی کے کراہنے کی آواز آ رہی تھی ... وہ دوڑتے ہوئے وہاں پہنچا ... ہسپتال کے کوریڈور کی دونوں جانب نظریں دوڑائیں، لیکن سب کمروں کے دروازے بند تھے ... وہ وہاں رک گیا ... جس کمرے سے اسے آوازیں آ رہی تھیں اس نے آہستہ سے اس کمرے کے دروازے پر دستک دی ... اور ہانپتے ہوئے پکارا ... دروازہ کھولیے دروازہ کھولیے ... ہے کوئی ... جلدی کھولیے دروازہ ...!!

وہ دروازے کے بازو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا اس کے دماغ میں فلم سی چلنے لگی ..... کچھ عرصہ قبل گھر سے سبھی مہمان عشائیے سے فارغ ہو کر روانہ ہو رہے تھے- وہ سب زوبی کے سالگرے میں آئے ہوئے تھے- اس نے اس تقریب میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی ... عزیز و اقارب کو مدعو کیا تھا ... گھر میں کافی گہما گہمی تھی .... شور و غل عروج پر تھا ... اسی طرح جاری رہا ... اور دیواروں کی سبز روغنی سطح پر آنے جانے والوں کی پرچھائیاں رقص

کرتی رہیں ... بچے اپنے اپنے گروہوں میں بٹ چکے تھے ... ہمہ اقسام کے پکوان، رنگ برنگے ڈھیر ساری مٹھائیاں، خوشبودار پھول اور کئی اقسام کے پھل، نغموں کی لہریں، گلکاریاں، غبارے، خوشبودار بخور اور جگمگاتے شمع دان..... قہقہوں، ہنسی مذاق اور گپ شپ سے گھر گونج رہا تھا....

زوبی اپنے ابو سے بہت پیار کرتی تھی- تقریب کے انتظامات اور اس کی ذمہ داریوں کو نبھاتے نبھاتے تھکا ہارا حامد جب گھر کے اندر داخل ہوا تو زوبی بھاگتے ہوئے اپنے ابو کی جانب مٹھائی بڑھاتے ہوئے بولی۔

"ابو ابو یہ مٹھائی کھاؤ بہت لذیذ ہے- یہ مجھے بہت پسند ہے- آپ بھی کھایئے-"

مسکراتی ہوئی لخت جگر نے حامد کے منہ تک مٹھائی بڑھا دی۔"اچھی ہے نا ابو جی...! اچھی ہے نا یہ مٹھائی ابو جی....!!"

"ہاں، بیٹا یہ مٹھائی تو بہت مزے دار ہے مجھے بھی پسند آئی...! یہ لو تم بھی کھاؤ.....!! حامد نے اپنی بیٹی کو مٹھائی کھلائی اور جو کام نپٹانے کے رہ گئے تھے ان کو پورا کرنے کے لیے آگے بڑھ گیا !!!

اتنے میں خالہ امی کی آواز آئی زوبی... زوبی....

زوبی دوڑتے ہوئے خالہ امی کے پاس پہنچی، "خالہ امی، خالہ امی! کیا آپ نے مجھے بلایا؟"

زوبی کی خالہ نے اسے اپنے پاس بٹھاتے ہوئے اس کے سامنے اپنے ساتھ لائے ہوئے وہ سارے کپڑے اور زیور رکھ دیے

زوبی خوشی سے ناچ اٹھی!

اسی وقت عافیہ امی امی آواز لگاتی ہوئی آئی...! اس آواز پر زوبی نے مڑ کر دیکھا عافیہ پیچھے سے خالہ امی کے چہرے کو ادھر ادھر گھماتے ہوئے ان کے ساتھ لاڈ سے کھیل رہی تھی....!!

زوبی کو اچانک اپنی والدہ کی یاد آئی....

اس نے خالہ امی کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا!

"خالہ امی، خالہ امی، میری امی جان کہاں ہیں؟"

میں بھی اپنی امی جان کے ساتھ کھیلنا چاہتی ہوں....

"میری امی کہاں ہیں خالہ امی؟"

زوبی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی امی اب اس دنیا میں نہیں ہیں...وہ صرف تین سال کی تھی کہ جب اس کی والدہ کو کورونا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے زوبی کو ماں سے دور رکھا گیا تھا- وہ اسی وبا میں دنیا کو خیر باد کہہ گئیں....اس واقعے کو پانچ سال ہوگئے لیکن زوبی اپنی ماں کو بھلا نہیں پائی، بس وہ سوچتی تھی کہ اس کی والدہ کہیں گئی ہوئی ہیں... آجائیں گی...! اب آئیں گی...اب آئیں گی!!...

زوبی نے اپنی خالہ امی کا چہرہ جو نیچے کی طرف جھکا ہوا تھا... اپنی طرف پھیرتے ہوئے پوچھا....

"میری امی کہاں ہیں....؟"

"وہ میرے پاس کیوں نہیں ہیں....؟"

آج میری سالگرہ ہے نا! میری امی کو بلاؤ....

آج میری سہیلیاں بھی اپنی اپنی امی کو لے کر آرہی ہیں.... مجھ سے پوچھیں گی نا.... میری امی کہاں ہیں....؟ بتاؤ نا! خالہ امی....

خالہ امی گہری سوچ میں پڑ گئیں.....

زوبی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس کی امی اب اس دنیا میں نہیں ہیں... وہ صرف تین سال کی تھی کہ جب اس کی والدہ کو کورونا ہو گیا تھا جس کی وجہ سے زوبی کو ماں سے دور رکھا گیا تھا- وہ اسی وبا میں دنیا کو خیر باد کہہ گئیں.... اس واقعے کو پانچ سال ہوگئے لیکن زوبی اپنی ماں کو بھلا نہیں پائی، بس وہ سوچتی تھی کہ اس کی والدہ کہیں گئی ہوئی ہیں ... آجائیں گی....! اب آئیں گی.... اب آئیں گی!!....

خالہ امی نے کوئی جواب نہیں دیا....

وہ دوڑتے ہوئے اپنے ابو جی کے پاس پہنچی .....

"ابو جی، ابو جی، ایک بات پوچھوں...؟"

"ہاں، کیا بات ہے بیٹا....؟ تم اتنی اداس کیوں لگ رہی ہو...؟

کیا میں تمہارے لیے کچھ لانا بھول گیا ہوں...؟"

زوبی نے اداس چہرے سے اپنا سر نفی میں ہلایا....

"پھر تم کیوں اتنی اداس ہو بیٹا...؟"

'وہ اپنے موبائل فون پر اپنی امی کا خیالی نمبر ڈائل کرتی رہی ...پھر اپنے موبائل فون کی گیلری کے البم میں اپنی ماں کی تصویر تلاش کرتی رہی....اور وہ سوچتی رہی کہ امی جان آئیں گی تو میں ساری باتیں بتاؤں گی...یہ بھی پوچھوں گی کہ وہ مجھے کیوں نہیں لے کر گئیں۔بہت ساری چیزیں دکھاؤں گی....امی جان کے بنائے ہوئے کھانے کھاؤں گی۔ اپنی پڑھائی اور اسکول کے بارے میں بتاؤں گی...'

زوبی کچھ نہیں بول پا رہی تھی...وہ خاموش ہوگئی....ابو جی نے اس کی سوالیہ آنکھوں کو پڑھ لیا،انہوں نے اسے گود میں بٹھا کر اس کے گھونگریالے بالوں کو ٹھیک کرتے ہوئے بولے...بیٹا بتاؤ...!"تم کیوں اتنی اداس ہو؟" بار بار پوچھنے پر وہ اپنے ابو جی کے کندھے پر سر جھکا کر معصوم انداز سے بولی،

" ابو جی، میری امی جان کہاں ہیں؟ مجھے اپنی امی جان سے بات کرنی ہے...ابو جی...ابو جی... میری امی جان کو بلاؤ آج میری سالگرہ ہے نا....."

وہ آہستہ آہستہ امی جان، امی جان پکارتی رہی....

پھر مایوس لہجے میں بولی" ابو جی، میری امی کو فون لگاؤ نا....! میری امی کہاں ہیں؟ وہ زار و قطار رونے لگی....!!

پھر وہ نہایت ہی عاجزانہ انداز میں بولی،

"ابو جی، میری امی کا فون نمبر دو نا....! میں اپنی امی سے بات کرنا چاہتی ہوں ....!!"

پھر اس نے اپنے ابو کی طرف دیکھا...

حامد کی آنکھیں سرخ اور نم ہوگئی تھیں۔! وہ کچھ بول نہیں پا رہا تھا...!!

زوبی حامد کے چہرے کو اپنی طرف کرتے ہوئے بولی"...ابو جی، ابو جی، امی کا موبائل فون نمبر دو نا؟"

حامد سے کوئی جواب نہیں بن پڑا،اس نے زوبی کو بہلانے کے لیے کہا،

"بیٹا اندر جاؤ... کوئی بلا رہے ہیں...."

اتنے میں خالہ امی کسی کام سے باہر آئیں زوبی پر نظر پڑی تو مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے جاتے ہوئے بولیں،

چلو چلو جلدی اندر چلو...!

مہمان آنے شروع ہو گئے ہیں...!! ہم جلدی جلدی تیار ہو جائیں گے....!!!

زوبی تیار ہو کر آئی۔ سرخ اور سنہرے کنارے والے دوپٹے کے آنچل میں وہ پری لگ رہی تھی- سب کی نگاہیں اسی پر ٹکی ہوئی تھیں .... خالہ امی دل ہی دل میں یہ دعائیں مانگ رہی تھیں کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنے حفظ و امان میں رکھے اور بری نظر سے بچائے....!! آمین

ساڑھے بارہ بجے شب تک تمام مہمان رخصت ہو چکے تھے---- تھکے ہارے میزبان بھی سونے کی تیاری کرنے لگے...!

آہستہ آہستہ تمام کمروں کی روشنیاں گل ہونے لگیں....!!

زوبی اپنے کمرے میں اپنے رشتے کی بہنوں کے ساتھ موبائل پر گیمز کھیل رہی تھی....بہت دیر ہو چکی تھی.... آخر سب یکے بعد دیگرے سونے لگے...زوبی اکیلی تھی جو سوئی نہیں تھی....

وہ اپنے موبائل فون پر اپنی امی کا خیالی نمبر ڈائل کرتی رہی ... پھر اپنے موبائل فون کی گیلری کے البم میں اپنی ماں کی تصویر تلاش کرتی رہی....اور وہ سوچتی رہی کہ امی جان آئیں گی تو میں ساری باتیں بتاؤں گی....یہ بھی پوچھوں گی کہ وہ مجھے کیوں نہیں لے کر گئیں...بہت ساری چیزیں دکھاؤں گی....امی جان کے بنائے ہوئے کھانے کھاؤں گی ...اپنی پڑھائی اور اسکول کے بارے میں بتاؤں گی...اور بہت سارا لاڈ و پیار کروں گی اور پھر اپنے بے قرار دل کو یہ دلاسا دینے لگی کہ دوبارہ کبھی امی جان کو کہیں نہیں جانے دوں گی...!

اسی تصور، امید اور امنگ کے ساتھ ادھورے خواب بنتی رہی...!!

'زوبی اپنے ابو جی کے لاڈ پیار میں پلی بڑھی۔حامد نے اسے ایک قیمتی موبائل فون دلایا تھا وہ موبائل فون دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی....! آج تو اس نے حد ہی کر دی، رات بھر اس نے موبائل فون دیکھا تھا...!!یہاں تک کہ چار بجنے والے تھے...تب وہ اپنی مسلسل جاری سوچ کے ساتھ، سونے کی کوشش کر رہی تھی، مگر نینداس کی آنکھوں سے دور تھی۔'

زوبی اپنے ابو جی کے لاڈ پیار میں پلی بڑھی۔حامد نے اسے ایک قیمتی موبائل فون دلایا تھا وہ موبائل فون دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی....! آج تو اس نے حد ہی کر دی، رات بھر اس نے موبائل فون دیکھا تھا...!!یہاں تک کہ چار بجنے والے تھے...تب وہ اپنی مسلسل جاری سوچ کے ساتھ، سونے کی کوشش کر رہی تھی، مگر نینداس کی آنکھوں سے دور تھی...!ایک عجیب سا احساس اس کے دل و دماغ پر طاری تھا...!!

زوبی کی خالہ امی تہجد کی نماز پڑھ رہی تھیں- زوبی ان کے پاس آئی اور بولی....

"میرے سر میں درد ہو رہا ہے اور نیند نہیں آ رہی ہے...!!"

وہ زوبی کو سر سہلاتے ہوئے اسے سلانے کی کوشش کرنے لگیں،لیکن زوبی کا سر درد بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

وہ ٹھہر بھی نہیں پا رہی تھی...! اچانک وہ کھڑے قد سے گر گئی اور بے ہوش ہو گئی...!!

اس کو ہسپتال لے جایا گیا .....ڈاکٹر نے اسے ائی سی یو میں داخل کیا جہاں دوسروں کا داخلہ ممنوع تھا .... کچھ دیر بعد ڈاکٹر نے ائی سی یو سے باہر نکلا تو حامد بیتابی سے اس کی طرف بڑھا۔"ڈاکٹر صاحب میری بچی کیسی ہے؟"

ڈاکٹر نے گمبھیر لہجے میں کہا آپ کی بچی شاید موبائل فون کا استعمال بہت زیادہ کرتی تھی۔موبائل فون کی الیکٹرومیگنیٹک لہروں کے اثر سے آپ کی بچی کا دماغ متاثر ہو گیا ہے۔اس کی زندگی کے بارے میں کوئی تیقن نہیں دے سکتا۔۔۔!

حامد تڑپ اٹھا.....!

لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔۔۔!!

حامد نے زوبی کو فون تو دلایا لیکن اس کی نگرانی نہیں کی۔اس نے زوبی کو بارہا فون میں مصروف پایا لیکن فون بینی سے منع کرنے کی کوشش نہیں کی کہ کہیں بن ماں کی بچی کا دل ٹوٹ نہ جائے..... لیکن اس کی اس غفلت نے یہ دن دکھایا۔

زوبی کی بے ہوشی طویل ہوتی گئی....!وہ کوما میں چلی گئی...!!

غمزدہ حامد کوریڈور میں حیران و پریشان ائی سی یو کے دروازے پر مایوس نظریں جمائے ہوئے... گہری سوچ میں گم تھا...پریشان کن خیالات.... کشمکش....زوبی کی جلد صحت یابی کے لیے دعائیں....اچھی خبر سننے کے انتظار میں بے چین سماعتیں....

سامنے والی کھڑکی کے نظارے سے اندازہ ہو رہا تھا کہ رات گزر چکی ہے، سورج کی پہلی کرنیں آسمان پر ہلکی سفیدی کے جلوے بکھیر رہی تھیں... ستارے مدھم پڑتے جا رہے تھے .... سبز پودوں کی ڈالیاں ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکوں سے ہچکولے کھاتی رہیں۔

جیسے ہی ائی سی یو کا دروازہ کھلا.... کسی کے قدموں کی آہٹ آئی .... حامد کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی....ایک عجیب سی بے چینی....ایک امید کی کرن.... آر ٹی پی سی آر.... نبض اور دل کی دھڑکن بتانے والی اسکرین کا سکوت.....شدت غم سے حامد چلا اٹھا ..... میری بیٹی .....اور چکرا کے گر پڑا___

❐❖❐

Dr. Hakeem Rayees Fathima
House No. 15-15/1/33 Road No. 5
Dharmapuri Nilayam,
Alind Employees Colony, Phase 3,
Opp. Serilingampally Mandal Office,
Hyderabad-500019(TS)

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ویر ساورکر اور تقسیم ہند کا المیہ

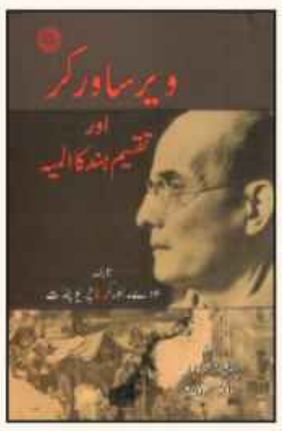

تالیف: اودے ماہورکر، چرایو پنڈت

مترجم: پروفیسر مظہر آصف، ڈاکٹر مسعود عالم

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 385+xxxviii

قیمت: 240 روپے

ہندوستانی مسلمان: اتحاد کی بنیاد حب الوطنی

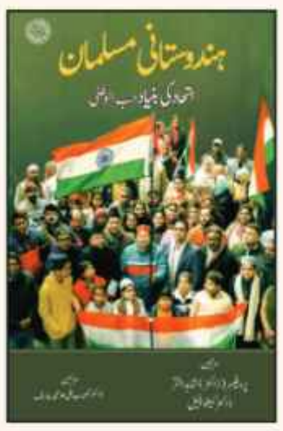

مرتبین: پروفیسر (ڈاکٹر) شاہد اختر
ڈاکٹر کیشو پٹیل

مترجمین: ڈاکٹر نصیب علی، محمد عارف

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: xl+211، قیمت: 150 روپے

کلیاتِ سعادت حسن منٹو (جلد دوم)

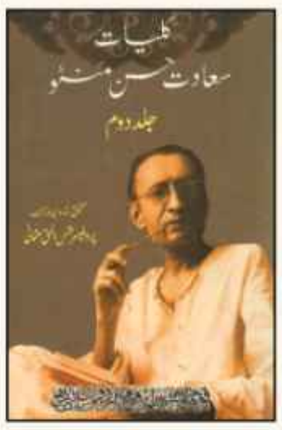

تحقیق، تدوین و ترتیب: پروفیسر شمس الحق عثمانی

تیسرا ایڈیشن: 2025

صفحات 23+576

قیمت: 305 روپے

ٹیگور بتیسی (ٹیگور کے بتیس افسانوں کا انتخاب)

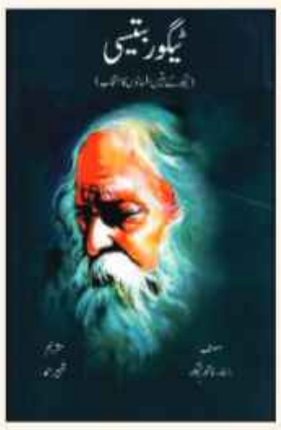

مصنف: رابندر ناتھ ٹیگور، مترجم: شبیر احمد

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 65+510

قیمت: 300 روپے

مرزا غالب: ایک سوانحی منظر نامہ

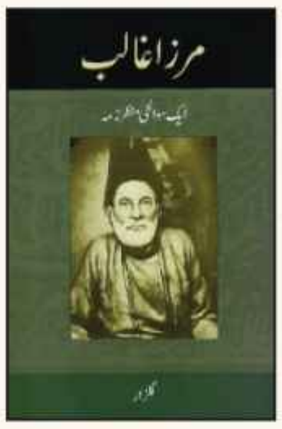

مصنف: گلزار

دوسرا ایڈیشن: 2025

صفحات: 23+247

قیمت: 160 روپے

نقوشِ کلام (سوانح حیات ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام)

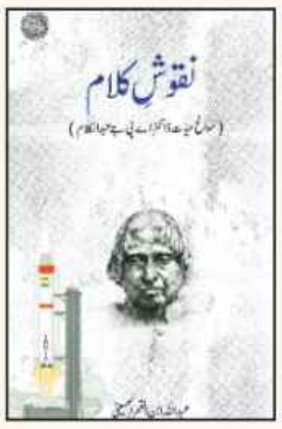

مصنف: عبداللہ ابن القمر الحسینی

پہلا ایڈیشن: 2025

صفحات: 20+460

قیمت: 255 روپے

Let's Learn Urdu
Beginner's Mannual for Urdu Script

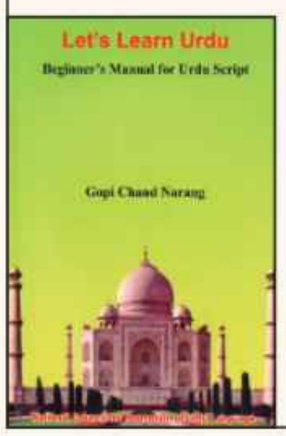

مصنف: گوپی چند نارنگ

ساتواں ایڈیشن: 2025

صفحات: 111

قیمت: 65 روپے

Work Book: Let's Learn Urdu
Beginner's Mannual for Urdu Script

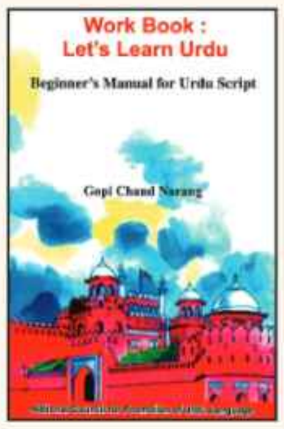

مصنف: گوپی چند نارنگ

ساتواں ایڈیشن: 2025

صفحات: 76

قیمت: 50 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

माहनामा ख्वातीन दुनिया मासिक, फ़रवरी – २०२६ वर्ष: १०, अंक: २
Mahnama Khawateen Duniya Monthly February 2026, Vol. 10, Issue: 2
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI. No. DELURD/2017/74026
DL (S)-17/3555/2024-26
ISSN 2581-4826
Date of Publication: 13-02-2026
Date of Dispatch : 14 and 15 of every month
Total Pages: 64

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.: sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Md. Shams Equbal, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at Makoff Printers, B-127, Sector 65, Noida-201301 (U.P)
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 Institutional Area Jasola New Delhi-110025